مذہب و تصوف کی جانب تھا، اس لئے غزل کے علاوہ انھوں نے نعت و منقبت کی طرف بھی توجہ کی ہے، ان اصناف کے علاوہ متعدد تاریخی قطعات، مثنوی اور قدسی کی مشہور نعت ع

مرحبا سید مکی مدنی العربی

اور جامی کی ایک غزل پر تضمین بھی مجموعہ کے آخر میں شامل ہے، کلام کا معیار زیادہ بلند نہیں ہے، تاہم اس سے ان کی قدرت اور پُرگوئی کا اندازہ ہوتا ہے، شروع میں جناب مالک رام صاحب اور سید وحید اشرف صاحب کے مقدمے بھی ہیں، اول الذکر نے شاعر کے خاندانی حالات اور کلام پر مختصر تبصرہ کیا ہے، اور جناب وحید اشرف نے ان کی شاعری کا پس منظر بیان کرتے ہوئے عہد بعہد گجرات کی شاعری کا جائزہ لیا ہے، اس سے گجرات کی اردو زبان و ادب کی خدمات کا پتہ چلتا ہے۔

تسنیم و کوثر۔ مرتبہ مولٰنا ابو سلمہ شفیع احمد، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۱۲، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، قیمت : دس روپیہ

پتہ : ادارہ ترجمہ و تالیف ۲۸ بھول بگان روڈ. کلکتہ ۱۷۔

سیرت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور دوسرے اصلاحی و دینی موضوعات پر کتابوں کی اشاعت کے لئے کلکتہ میں ادارۂ ترجمہ و تالیف کا قیام عمل میں آیا ہے، اس کی طرف سے معارف میں کئی کتابیں تبصرے کے لئے موصول ہوئی ہیں، جن پر آئندہ ریویو کیا جائے گا، زیر نظر کتاب میں ادارہ کی بعض مطبوعات کے مفید مضامین کا انتخاب شائع کیا گیا ہے۔ اس میں مختلف دینی، ملی، قومی، اخلاقی اور اصلاحی عنوانات کے تحت موثر اور سبق آموز مختصر تحریریں شائع کی گئی ہیں، ان کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے مفید ہوگا۔

"ض"

جلد ۱۳۲ ماہ صفر و ربیع الاول ۱۴۰۴ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۳ء عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

۰۰۰۰۰۰۰۰

شذرات

۹-۱۱- نومبر ۱۹۸۳ء کو علامہ محمد اقبال پر دوسری بین الاقوامی کانگریس لاہور میں ہوئی جو خوش اسلوبی اور خوش سلیقگی سے انجام پاگئی،

یہ بین الاقوامی کانگریس پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ہر پانچ سال کے بعد ہوا کرتی ہے، پہلی کانگریس ۱۹۷۷ء میں بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی، جس میں تقریباً ہر ملک سے بیرونی مہمان بکثرت آئے تھے، اس سال وہ تزک و احتشام نہ تھا، اس میں بیرونی مہمانوں میں پروفیسر شیلا میک ڈونا کنیڈا، ڈاکٹر کامران مقدم صفیاری ایران، ڈاکٹر محمد عابدین ترکی، مسز اختر امام بنگلہ دیش، اس خاکسار کے علاوہ آل احمد سرور اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد ہندوستان سے آئے، کچھ نمائندے انگلستان اور امریکہ سے بھی آئے تھے، مگر وہ پاکستانی ہی تھے جو وہاں اپنی اپنی ملازمتوں کے سلسلہ میں مقیم ہیں، اندرون پاکستان کے نمائندوں کی تعداد پینتالیس ۴۵ تھی، پہلے روز کے کھلے اجلاس کے خصوصی مہمان حکومت پاکستان کے وزیر دفاع جناب میر احمد علی خاں تالپور تھے، خطبہ استقبالیہ پنجاب یونیورسٹی کے لائق وائس چانسلر جناب ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا کا تھا، اسی کھلے اجلاس کی مقالہ خوانی کا افتتاح کرنے کا اعزاز پروفیسر آل احمد سرور کو حاصل ہوا، ان کا مقالہ انگریزی میں تھا، انھوں نے وقت کی کمی کی وجہ سے دس منٹ میں اس کا خلاصہ بہت ہی عمدہ اور موثر انداز میں پیش کیا، جناب میر احمد علی خاں تالپور نے خصوصی مہمان کی حیثیت سے اپنی تقریر میں کلام پاک کی آیات اور علامہ محمد اقبال کے علاوہ ہندوستان کے شعراء میں حسرت موہانی، اکبر الہ آبادی اور اصغر گونڈوی کے اشعار برجستہ پڑھ کر اپنے بلند پایہ علمی اور ادبی ذوق کا ثبوت دیا،

مختلف اجلاسوں کی صدارت چیف جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال (لاہور) جسٹس غوث علی شاہ وزیر قانون و تعلیم حکومت سندھ (کراچی) ڈاکٹر محمد عابدین (ترکی) ڈاکٹر سید عبداللہ (چیف ایڈیٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لاہور) ڈاکٹر منیر الدین چغتائی (پرو وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی) اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد (ہندستان) نے کی، ایک اجلاس کا شریک صدر یہ خاکسار بھی رہا،

مقالات کے موضوعات کی یہ نوعیت پہلے سے متعین کر دی گئی تھی (۱) اقبال اور اسلامی نشاۃ الثانیہ (۲) اقبال اور پاکستان کی تحریک (۳) اقبال اور تیسری دنیا (۴) اقبال اور احترام آدمی، ان ہی موضوعات پر تقریباً پچپن ۵۵ مقالے پیش ہوئے جو دو جلدوں میں ٹائپ کر کے تقسیم کر دیئے گئے تھے، ان کی کثرت اور وقت کی کمی کی وجہ سے مقالہ نگاروں کو بہت ہی عجلت میں اختصاراً اپنے مقالے پڑھنے پڑے، ان پر بحث و مباحثہ کا موقع نہیں ملا، البتہ مختلف اجلاسوں کے آخر میں جو صدارتی تقریریں ہوئیں، ان سے حاضرین محظوظ اور مستفیض ہوتے رہے، ڈاکٹر جاوید اقبال کی تقریر سننے کے لئے تو حاضرین ہمہ تن گوش ہو گئے، انھوں نے اپنے والد بزرگوار کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر جو روشنی ڈالی اس سے بہت کچھ سیکھا گیا، ہم ہندوستانی نمائندوں کو خوشی اور حیرت ہوئی جب ان کی زبان سے یہ سنا کہ ہندوستان میں علامہ محمد اقبال پر پاکستان سے زیادہ کام ہوا ہے، پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی صدارتی تقریر سن کر ایک بزرگ نے کہا کہ اس کافر بچہ نے تو سب کو پچھاڑ دیا،

ہندوستانی نمائندوں سے کئی جگہوں پر تقریریں کرائی گئیں، مرکزیہ مجلس اقبال کی ایک تقریب میں اس خاکسار کو بھی علامہ محمد اقبال پر بولنے کے لئے کہا گیا، جو بن پڑا، جذباتی انداز میں بولتا چلا گیا، معلوم نہیں میری کیا باتیں حاضرین کو پسند آتی گئیں کہ وہ تالیوں کی گونج میں اس کو سنتے رہے، جلسہ کے بعد جناب ڈاکٹر جاوید اقبال نے فرمایا کہ یہ تقریر میں نے اشکبار آنکھوں کے ساتھ سنا، میں نے عرض کیا کہ یہ آپ کا لطف و کرم ہے، ورنہ تقریر تو ایسی نہ تھی،

ایک بہت ہی شاندار تقریب میں جناب ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایوان اقبال کے آغاز تعمیر کے افتتاح کی رسم ادا کی، دعوتیں جا بجا ہوئیں جن میں علامہ محمد اقبال کی صاحبزادی منیرہ بیگم کے یہاں کی دعوت خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس میں پنجاب کے گورنر صاحب جناب ملک غلام جیلانی اور حکومت پاکستان کے وزیر دفاع جناب میر احمد علی خاں تالپور صاحب ہندوستانی نمائندوں سے بڑی فراخدلی، بے تکلفی اور محبت سے ملے، ایک شام ہم لوگ گلشن اقبال میں مدعو تھے، یہ علامہ محمد اقبال کے نام پر ایک بہت ہی طویل و وسیع اور عریض پارک بنایا گیا ہے، جس کے سبزہ زاروں، مرغزاروں، پھولوں اور آبشاروں کی وجہ سے لاہور شہر کے حسن اور رونق میں بھی اضافہ ہو گیا ہے،

آخری دن شام کو جناب ڈاکٹر جاوید اقبال نے ہندوستانی مہمانوں کو مخصوص طریقہ پر اپنے دولت کدہ پر ایک بہت ہی پرتکلف چائے پر مدعو کیا، جس میں ڈاکٹر معز الدین سابق ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی اور فی الحال وزیٹنگ فیلو اقبال چیر کیمبرج یونیورسٹی اور برمنگھم سے آئے ہوئے ڈاکٹر اے ایس اے ڈرانی بھی شریک ہوئے، تقریباً تین گھنٹے بہت ہی دلچسپ

اور پر کیف صحبت رہی، اس میں ڈاکٹر جاوید اقبال کی شخصیت کو دلکش اور دلآویز پایا، ان کے دولت کدہ کی ایک دیوار پر جاوید نامہ کے تمام مناظر کی مصوری دیکھ کر ہم لوگ بیحد محظوظ ہوئے، علامہ محمد اقبال کی بعض نظموں کا کیسٹ سننے کا بھی یہاں موقع ملا، اس کو سن کر ہم لوگ کچھ ایسے متاثر ہوئے کہ جناب جاوید اقبال نے اس کے فروخت کرنیوالے سے منگوا کر ایک ایک کیسٹ نذر کئے، اس بے تکلف صحبت میں ہر قسم کی گفتگو رہی، اس خاکسار نے اس سلسلہ میں عرض کیا کہ ہم دار المصنفین والے علامہ محمد اقبال کو متفکر اسلام، اسرار الٰہی کا محرم، رموزِ شریعت کا آشنا، کاروانِ ملت کا حدی خواں، اور فلسفۂ اسلام کا ترجمان سمجھتے ہیں، اگر کوئی ان کے نہاں خانۂ زندگی میں تاک جھانک کر ان کو مجروح کرنے کی کوشش کرنا چاہتا ہے تو ہم میں ویسا ہی اشتعال پیدا ہوتا ہے جیسے ہماری کسی بھی پیشوا پر حملہ آور ہو کر کوئی ان کی توہین کرے، مجلس کے اور رفقا نے اپنی معروضیت پسندی کی وجہ سے ہماری اس رائے کو تنہا پسندی پر محمول کیا، مگر ہم اپنی رائے میں تبدیلی کرنے کو تیار نہیں ہوئے،

لاہور سے روانہ ہوتے وقت ہم لوگوں کے ساتھ اقبال اکیڈمی کی کچھ کتابیں ساتھ کر دی گئیں، یہاں کے قیام میں پروفیسر آل احمد سرور دامیوں اور نقادوں کے محبوب ہونے کے محبوب بنے رہے، پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا تو یہ سابق وطن تھا، ان کے ملنے والوں اور قدر دانوں کا حلقہ بہت وسیع رہا، خاکسار کو بھی اپنے کرمفرماؤں میں سے ڈاکٹر سید عبد اللہ، شیخ نذیر حسین، پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم، ڈاکٹر محمد یار خاں، ڈاکٹر شریف المجاہد، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر محمد انعام الحق کوثر، ڈاکٹر برہان الدین ہاشمی، ڈاکٹر محمد ریاض، ڈاکٹر محمد فرمان فتح پوری، قاری محمد ظریف سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، جناب شیخ نذیر حسین صاحب نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی ۲/۱۴ جلد نذر کی جس کو حرزِ جاں بنایا، پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر خیرات محمد صاحب نے فرداً فرداً مل کر اپنے حسنِ اخلاق کا ثبوت دیا، جناب پروفیسر خواجہ غلام صادق اس تقریب کی تنظیمی کمیٹی کے سکریٹری تھے، وہ ہم لوگوں کو ہر قسم کی راحت اور سہولت پہنچانے میں ہمہ تن سرگرم اور مشغول رہے،

لاہور میں کافی سردی پڑ رہی تھی، رات کو دیر تک ملنے ملانے میں جاگنا پڑا، جس سے طبیعت خراب ہو گئی، دار المصنفین کے ایک کام کے سلسلہ میں اسلام آباد نہ جا سکا، کراچی چلا آیا، یہاں استاذی المحترم حضرت سید صاحب کی سالانہ برسی منانے کی تیاری پورے جوش و خروش سے ہو رہی تھی، اس کی تقریبات میں شرکت کرنے کا موقع ملا جس کی تفصیل معارف کی آئندہ اشاعت میں ناظرین ملاحظہ کریں،

مقالات

متشرقین کے اعتراضات کی نشر و اشاعت کس طرح ہوتی ہے؟

اور

ان کی نوعیت، اغراض اور خاص محور

مترجمہ ضیاء الدین اصلاحی

"گو یہ مضمون الاستاذ نذیر حمدان کی کتاب "الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فی کتابات المستشرقین" کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے، مگر اس میں بعض مفید اور اہم باتیں آگئی ہیں، اس لئے مستشرقین اور اسلام کے سلسلہ میں اس کی اشاعت بھی مناسب معلوم ہوئی"۔ (معارف)

متشرقین نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں اپنے اعتراضات میں ملمع کاری کر کے انھیں بہت دلفریب اور خوشنما بنا دیا ہے۔ اور دنیائے اسلام کے افکار و عقائد اور نظام تعلیم و تربیت پر اثر انداز ہونے کے لئے عربی زبان میں ان کے ترجمے بھی کئے ہیں۔ جو اسلامی مکتبوں (بک ڈپو) میں فروخت ہو رہے ہیں۔ بعض ممتاز اہل عرب اور مسلمان بھی ان کے خوشہ چیں ہیں، اور وہ ان سے استفادہ کے لیے مغربی ملکوں کا سفر کرتے ہیں۔ اور انھیں بھی اسلامی ملکوں میں آنے کی دعوت دیتے ہیں، اس قسم کے لوگ در اصل اسلامی افکار کی بنیادیں متزلزل کرنے میں متشرقین کے

شریک و معاون ہوتے ہیں۔

دنیا کی موجودہ اقتصادی پالیسی اور حکومتوں کا وفاق بھی مستشرقین کے شکوک و شبہات کو پروان چڑھا رہا ہے، چنانچہ ان کے افکار و نظریات کی اشاعت کے لیے کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے۔ پہلے ان کے خیالات مقامی زبانوں میں شائع ہوتے ہیں۔ پھر عربی اور دوسری زبانوں میں انکے ترجمے ہوتے ہیں۔

مستشرقین کے طعن و تشنیع اور افتراپردازی سے اسلام، اسلامی تہذیب اور بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کا کوئی گوشہ محفوظ نہیں ہے۔ وہ مکمل تیاری اور منظم منصوبے کے بعد جب اسلام کے خلاف بہتان تراشی کرکے شبہات وارد کرتے ہیں تو ان کی حوصلہ افزائی کے لیے عیسائی مبلغین اور استعمار پسند طاقتیں ان کو دنیا بھر میں پھیلانے اور عام کرنے کی اسکیمیں تیار کرتی ہیں اور کانفرنسیں منعقد کرتی ہیں۔ اسلام کو ہدف طعن بنانے والے بعض مستشرقین سرکاری عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ اس طرح انھیں مادی استعمار کی تعمیر و استحکام اور اسلامی افکار کو مغربی سانچہ میں ڈھالنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کی تکمیل کے لیے وہ عربوں اور مسلمانوں میں سے اپنے ان معاونین کا انتخاب کرتے ہیں جو فکری اور علمی حیثیت سے ممتاز ہوتے ہیں اور ان کے مادی و فکری موقف کو درست ثابت کرتے ہیں۔ یہ صورتِ حال انڈونیشیا میں ہالینڈ کے غلبہ، عربی ملکوں میں برطانوی اور فرانسیسی استعمار اور خصوصاً مصر پر نپولین اور الجزائر و مغرب پر فرانس کے حملہ کے زمانہ میں پیش آچکی ہے، مستشرقین کے اعتراضات و الزامات کے نشو و نما پانے اور ان کے نشر و اشاعت کے خاص اسباب و ذرائع یہ ہیں۔

الف) گرجا اور عیسائی مشنریاں | مونسیور کولی نے "دین حق کی بحث و تحقیق" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر بالکل مسخ کرکے پیش کی گئی ہے۔ مصنف نے عصبیت اور صریح جانبداری سے کام لے کر اسباب بیان کئے بغیر جارحانہ اور تحکمانہ انداز میں اعتراضات عائد کئے ہیں، وہ لکھتا ہے "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اخلاق و شرافت کو خیرباد کہہ کر اپنے پیروؤں کے ہاتھ میں تلوار رکھی، بدکاری اور لوٹ مار کی ان کو کھلی چھوٹ دی، اور جنگ میں ہلاک ہونے والوں کو اس کی بشارت سنائی کہ انھیں دائمی لذت و راحت نصیب ہوگی"۔ ایسی صریح کذب بیانی اور یاوہ گوئی کے بعد مستشرقین صحیح دینی و تاریخی حقائق سے کس طرح واقف ہو سکتے ہیں۔

ڈلیسون نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دو بہتان تراشے ہیں۔ اول یہ کہ آپ انجیل سے واقف تھے۔ اور اسی سے اخذ و استفادہ کرتے تھے، دوم یہ کہ آپ کی انجیل سے واقفیت ناقص تھی اور آپ نصرانیت کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے۔ مگر اسی ناواقفیت اور نصرانیت کی بگڑی ہوئی صورت پر آپ نے اپنے اس دین کی بنیاد رکھی جسے عربوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ عیسائی مبلغین نے یہ اور اسی قسم کے دوسرے غلط اور بیجا الزامات مستشرقین کے ذہنوں میں نقش کر دئے ہیں، جس کے نتیجہ میں انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام پر ایسے رکیک اور ناروا اعتراضات کئے ہیں جن سے ان کی سیرتیں اور شخصیتیں بالکل مسخ ہوگئی ہیں۔

عیسائی مشنریوں کے منصوبے بہت منظم، وسیع اور گوناگوں ہیں۔ وہ مشرق میں انکی اشاعت کے لیے مبلغین بھیجتی ہیں۔ امریکہ نے اس میدان میں سبقت کی اور بیروت، قاہرہ، استنبول اور دمشق وغیرہ میں اپنے قدم جمائے یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اور اسی انداز پر اب تک مغربی افکار و اعمال کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ ہاملٹن گب اور دیگر مستشرقین کے مباحثہ میں اس کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اور سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہونے والی کتاب "اسلام کا نظریہ" میں بھی اس کا ذکر ہے۔

(ب) مادی استعمار — مستشرقین کی فکری و اعتقادی کاوشوں پر استعمار پسند پورا اعتماد اور بھروسہ کرتے ہیں۔ اور ان میں مزید ایسے شکوک و اعتراضات کا اضافہ کرتے ہیں، جن کا اسلام اور ذاتِ نبویؐ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ان کو اطمینان ہے کہ مسیحیت مشرق میں مغربی استعمار کی بنیاد ہوگی۔ اسی بنا پر وہ مشنریوں کے مشن کو ہموار اور وسیع کرنے کے لئے ان کی ہر ممکن امداد و اعانت کرتے ہیں، ان کے لیے مال و اسباب مہیا کرتے ہیں۔ اور انھیں اقتدار و اختیار بھی عطا کرتے ہیں۔ دراصل شروع میں مستشرقین عیسائی مبلغین اور راہبوں کے کندھوں پر سوار ہوتے ہیں۔ پھر وہ استعماریت سے اپنا تعلق قائم کرتے ہیں۔ اس طرح نتیجہ کے اعتبار سے مستشرقین کی تگ و دو کا مقصد بھی فکری استعمار ہے۔ وہ اسے مستحکم کرنے کے لیے دو طریقے اختیار کرتے ہیں۔ (۱) اسلام کی تاریخی اور عظیم الشان شخصیتوں کو مجروح اور کمتر قرار دیتے ہیں۔ جن میں سرفہرست خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے۔ اور (۲) اس کے مقابلہ میں استعمار پسندوں کی شخصیتوں کو اہم اور برگزیدہ ثابت کرتے ہیں، اسی لئے استعماریت کے دور میں عالم عرب اور دنیائے اسلام کو استعمار پسندوں کے حالات اور کارناموں سے جس قدر واقفیت ہوئی اس قدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی زندگی، سیرت اور کارناموں سے نہیں ہوئی۔ جو لوگ استعمار پسندی کے اس دور کو دیکھ چکے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مستشرقین اپنے ان دونوں مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے یا تو کلیسا کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں یا پھر استعمار اور توسیع پسندوں کے اشتراک سے ریشہ دوانیاں کرتے ہیں، ان کو حق کی تلاش و جستجو سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ شبہات وارد کرنے اور پروپگنڈا کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، اور عیسائی مشنریوں اور مشرق میں ان کے نمائندہ مبلغین کے لیے ساز و سامان مہیا کرتے ہیں۔ تاکہ مسلمانوں کے علوم، افکار، عقائد، اشخاص اور زبان و تہذیب کی اچھی طرح مذمت اور تنقیص کی جاسکے۔

(ج) تجارتی کمپنیاں — استعمار پسندوں نے عربوں اور مسلمانوں کے بیش قیمت علمی سرمایہ میں سے بہت کچھ چیزیں سرقہ کی ہیں۔ اس پر تجارتی اداروں اور کمپنیوں کا قبضہ ہے۔ اہل عرب کو اپنے علوم و آداب کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ تھا۔ اس لیے انھیں نہایت سستے اور معمولی داموں پر انہیں حاصل کر کے مستشرقین کی تحقیق و تحشیہ کے بعد شائع کیا گیا۔ اور اشاعت کے لیے ایسی چیزیں منتخب کی گئیں جو غیر اہم اور فکری حیثیت سے زیادہ بلند پایہ نہ تھیں، تاکہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی توجہ معمولی چیزوں کی طرف مرکوز ہو کر رہ جائے۔ پھر ان اداروں نے اسلامی تہذیب اور کلچر کی کتابوں کی تجارت اپنے لیے مخصوص کر لی جس کا منافع مستشرقین پر خرچ کیا جاتا تھا تاکہ وہ ترتیب و تحشیہ اور طباعت و اشاعت کا کام پوری دلچسپی اور سرگرمی سے انجام دے کر ان کے ناپاک عزائم کی تکمیل کر سکیں۔

تجارتی کمپنیوں کے پیش نظر دو طرح کے اغراض تھے (۱) اسلام کو مغربی اور اسلامی دنیا میں مسخ کر کے پیش کرنا اور اس کی شخصیتوں کو مجروح اور داغدار بنانا۔ اپنی اس ناپاک مہم کو فروغ دینے کے لیے وہ مستشرقین کو اسلام کے خلاف طرح طرح کے شبہات و الزامات کی کرید کرنے پر آمادہ کرتی تھیں (۲) اسلامی علوم کی کتابوں کا حق طباعت اپنے لئے مخصوص کر کے ناجائز کمائی کرنا۔

(د) معاشی و شخصی — مستشرقین کو تقویت اس طرح بھی ملی کہ بعض لوگوں کے لیے رزق کے دوسرے وسائل و ذرائع مسدود ہو گئے تو انھوں نے ان کا ساتھ دینا شروع کیا، کچھ ایسے لوگ بھی ان کے ہم نوا ہوئے جنھوں نے محسوس کیا کہ ان کی فکری و علمی صلاحیت دوسرے فضلا اور ماہرین علوم کے برابر نہیں ہے، اسی طرح بعض حضرات مسیحی سوسائٹی میں اپنی براہ راست ذمہ داریوں سے آزاد ہونے کے لیے بھی ان کا ساتھ دینے پر مجبور ہوئے، غرض ان لوگوں کا مقصد اپنی کوتاہی اور فکری عجز و نقص پر پردہ ڈالنا اور حصول معاش تھا، کیونکہ رزق و معیشت کے دوسرے

وسائل و ذرائع کے مقابلہ میں یہ زیادہ آسان صورت تھی اور اس میں کم تنگ و دو بھی کرنی پڑتی تھی

اس سے معلوم ہوا کہ یہ جذبہ بھی ان بے شمار الزامات و شبہات کا سرچشمہ ہے، جو اسلام پیغمبر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خصوصاً عائد کئے گئے ہیں۔ اوپر بیان کئے گئے اسباب کی جن اسلامی تصنیفات میں نشاندہی کی گئی ہے اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

المستشرقون، المستشرقون والدراسات الاسلامیہ، التبشیر والاستعمار، دفاع عن الاسلام یہ تمام کتابیں ان کتابوں کی تردید میں لکھی گئی ہیں جو مستشرقین کے شکوک وشبہات اور آرا وافکار پر مشتمل ہیں۔ جیسے وجہۃ الاسلام اور الغارۃ علی العالم الاسلامی، محب الدین خطیب نے اخبار المؤید میں ان کا عربی ترجمہ کیا تھا، ان سے عیسائی مشنریوں اور استعمار پسندوں کے منصوبوں اور عزائم کا پتہ چلتا ہے۔

رہی بروتوکولات صہیون (یہودی یادداشت) تو یہ ۱۸۰۵ء میں شائع ہوئی مگر اس کی شہرت گذشتہ صدی کے آخر میں ہوئی۔ محمد خلیفہ تونسی نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا، اس سے اخلاق وانسانیت کو رسوا و برباد کرنے، آسمانی عقائد کو ضعف و اضمحلال سے ہمکنار کرنے اور نفرت وحسد کی آگ بھڑکانے میں یہودیوں کے کردار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور دنیا پر غلبہ و تسلط حاصل کرنے کے ان کے ناپاک عزائم اور ارادے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے خلاف الزام اور شبہات عائد کرنے اور بغض وعداوت پھیلانے میں یہودی مستشرقین کی ریشہ دوانیاں سب سے زیادہ خطرناک ہیں، وہ اپنے مذہبی احکام کے مجموعہ تالمود کو خدا کی وحی سے بھی زیادہ مقدس اور برتر مانتے ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو تورات سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ دوسرے یہودی مستشرقین بھی اسی قسم کی بے سروپا باتیں کہتے ہیں۔ قرآن واحادیث نبوی کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسلامی عقائد واحکام کا استخفاف کرتے ہیں۔

(۸) علمی وتہذیبی

بعض ذاتی وطبعی اسباب و ذرائع سے بھی مستشرقین کے خیالات کی نشرو اشاعت ہوئی، کیونکہ کچھ فارغ البال لوگ اس لیے مشرقی علوم کا مطالعہ کرتے ہیں کہ ان کو سیر وسیاحت سے طبعی دلچسپی ہوتی ہے۔ اور دنیا کی قدیم تاریخ وتہذیب سے واقف ہونے کا شوق رکھتے ہیں۔

اعتدال پسند گروہ کی مفید خدمات

تسلیم کرنا چاہیے کہ اعتدال پسند مستشرقین کے ایک گروہ نے سیرت نبوی کے قدیم و اولین ماخذ کی ترتیب واشاعت کا کام بھی انجام دیا ہے، اس سلسلہ میں ابن ہشام کی سیرت، واقدی کی کتاب المغازی، ابن اثیر کی الکامل اور طبری کی تاریخ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ مستشرقین نے ان پر حواشی وتعلیقات لکھ کر اور ان کی متعدد فہرستیں مرتب کرکے دوسروں کو مزید کاوش سے بے نیاز کر دیا ہے۔ انھوں نے اکثر کتابوں کے ملکی زبانوں میں ترجمے بھی کر دیے ہیں۔ تاکہ بحث وتحقیق کرنے والوں کو ان سے مدد ملے اور وہ ان کی جانب رجوع کر سکیں۔

بہرحال اس گروہ نے تاریخی سرمایہ اور خاص طور پر سیرت نبوی سے متعلق کتابوں کی نشرواشاعت میں سعی بلیغ کی ہے۔ اور محنت و دیدہ ریزی کے علاوہ اپنا خطیر سرمایہ بھی لگا دیا ہے۔ کئی کئی افراد مل کر ایک کتاب کو متعدد جلدوں میں مرتب کرتے ہیں اکثر محققین علمائے اسلام ان کی ان کاوشوں کے مداح اور شکر گذار ہیں، چنانچہ ڈاکٹر نجار نے مذاہب التفسیر الاسلامی اور شیخ احمد شاکر نے مفتاح کنوز السنۃ کے مقدموں میں اس کا اعتراف کیا ہے اور محمد کرد علی نے بھی ان کی کوششوں کے نتائج کو سراہا ہے۔

اس جماعت کی کاوشوں سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ جب سیرت نبوی کے اولین ماخذ مکمل صورت میں چھپے اور ان کے محققانہ نسخے دوسرے مستشرقین کے ہاتھوں میں پہنچے تو سیرت نبوی کا مطالعہ

وتحقیق اچھے اور بہتر انداز میں کیا جانے لگا اور اس کے مفید نتائج بھی سامنے آئے۔

یہ گروہ ایسا ہے جو بحث ومطالعہ کا صحیح رخ متعین کر کے اصل تاریخی حقائق تک پہنچنا چاہتا ہے۔ لیکن عام اور بڑی جماعت کی عصبیت وجانبداری کا وہی حال ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مستشرقین کے اعتراضات والزامات استعمار پسندوں اور عیسائی مشنریوں اور مبلغین کے مضبوط باہمی تعاون کے نتیجہ میں وجود میں آئے اور پروان چڑھے ہیں، ان کا مشترکہ پروگرام اور مقصد یہ ہے کہ عربی اور اسلامی تہذیب، تمدن، تاریخ اور خاص کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اور سیرت مبارکہ کو مغربی افکار کے سانچہ میں ڈھال لیا جائے۔

۲۔ شکوک والزامات کی نوعیت گو مستشرقین کے تمام شبہات واعتراضات کی نوعیت متعین اور ایک ہے۔ تاہم آسانی کے لئے انھیں حسب ذیل صورتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

فکری انھیں مندرجۂ ذیل وجوہ سے فکری کہا جا سکتا ہے۔

(الف) یہ انسانی فکر وکاوش کا نتیجہ ہیں۔ اور ان کی بنیاد ذہنی وسائل پر ہے۔

(ب) ان میں انسانی نفسیات کے خواص کی بحث وکرید اور ان کے طول وعرض کا گہرائی سے جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ ان پر عائد ہونے والے اشکالات کا ازالہ کیا جائے۔

(ج) یہ اسلامی فکر کو متزلزل کرتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سیرت وشخصیت کو مسخ کرتے اور بگاڑتے ہیں۔ جو منصب نبوت پر فائز اور قیادت وسیادت کے لحاظ سے بہترین نمونہ تھی۔

(د) رسولؐ کے بارہ میں عربی وغیر عربی افکار میں تردد اور شکوک پیدا کرتے اور ان کی جانب سے لوگوں کو متنفر اور بیزار کرتے ہیں۔

(ہ) ایک طرف حق کی تائید وحمایت کرنے والے جذبات وافکار کو مضمحل اور پست کرتے ہیں اور دوسری جانب ناپاک اور خود غرضی پر مبنی افکار کے ذریعہ شبہات کے دائرہ کو وسعت وقوت بخشتے ہیں۔

(و) اس اعتبار سے بھی ان کو فکری کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی اصل اور تمام تر بنیاد فکر پر ہے، اور اس فکر اور ذہنی مفہوم کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت وجہاد کے ذریعہ آبیاری کی ہے، اس بنا پر آپ کی ذات، شخصیت، سیرت اور سنت کے بارہ میں جو بھی طعن وتشنیع کیا جائے گا وہ اسلامی فکر ہی کے بارہ میں سمجھا جائے گا۔

دینی یہ شبہات ان حیثیتوں سے دینی دائرہ میں آتے ہیں۔

(الف) ان کا خاص تعلق احادیث نبویؐ سے ہے جو رسول اللہؐ کے قول، فعل، تقریر وارشاد کا مجموعہ اور اسلام کا دوسرا اہم ماخذ ومصدر ہے۔

(ب) احادیث کے بارے میں یہ وہم اور غلط فہمی پیدا کرتے ہیں کہ ان میں بیان کئے گئے آنحضرتؐ کے افکار واعمال آسمانی کتابوں یا انسانی سرچشموں سے ماخوذ ومستنبط ہیں۔

(ج) رسول اللہؐ کی زندگی کی ایسی غلط اور مادی تفسیر وتعبیر کرتے ہیں۔ جس سے شجاعت، ذہانت، عبقریت اور آزادی فکر کو اس کی جانب منسوب کیا جا سکے مگر وہ وحی اور ربانی کمالات سے تمام تر عاری ہو۔

(د) کبھی اسلام میں تضاد اور کبھی اس میں تطبیق دیکر لوگوں کے دلوں میں شک وتذبذب پیدا کرتے اور رسالت پر عقیدہ وایمان کو متزلزل کرتے ہیں، جب کہ اسلام کا جیتا اور جاگتا نمونہ خود نبی اکرمؐ ہی کی زندگی اور ذات ہے۔

(ہ) وحی ونبوت پر مستشرقین کے طعن وتشنیع کا خاص سبب یہ ہے کہ یہ رسول کے اوصاف

(کمالات میں سب سے نمایاں اور اہم وصف ہے، اگر اسی کو شکوک اور مشتبہ کر دیا جائے تو دوسرے تمام اوصاف و کمالات خود بخود بے حقیقت ہو جائیں گے۔

(و) اعتراضات کا تعلق دین کے سب سے اہم بالشان مسائل سے ہے کیونکہ یہ آپ کے عقیدہ و فکر یا طرز زندگی اور جہاد وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں اور ان میں شبہہ واقع ہونے کے بعد خود مسلمان بھی بھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔

تاریخی | ان اعتراضات کی نوعیت تاریخی بھی ہے کیونکہ

(الف) یہ اُن تاریخی واقعات سے پیوستہ ہیں جن کا تعلق اسلام سے قبل و بعد کی رسول اللہ کی زندگی سے ہو بلکہ تاریخ کی ابتدا و انتہا سے بھی۔

(ب) یہ تاریخ کو اس کے اصلی موضوع سے ہٹا دیتے ہیں اور ان سے تاریخ کے علمی و حقائق کے بجائے ذاتی رجحان و مطالعہ کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔

ج) یہ الزامات چند مفروضوں اور تاریخی شکوک کے ارد گرد گردش کرتے ہیں، حالانکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے وفات تک کی پوری زندگی نہایت واضح اور روشن ہے۔

(د) ان شبہات نے بعض تاریخی حقائق کو بھی افترا پردازی اور گمراہی میں مخلوط کر دیا ہے، اس بنا پر حقائق وغیر حقائق، تحلیل و اعتراض اور تاریخ و افسانہ میں حد فاصل قائم کرنا اور امتیاز کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

(ہ) تاریخ کا مقصد اللہ کی جانب انسانیت کی رہنمائی ہے، جیسا کہ آرنلڈ ٹوئن بی نے اپنی مشہور کتاب "نظریۂ تاریخ" میں لکھا ہے، اس لئے اگر رسول اللہ ہی کی تاریخ مطعون کر دی جائے، تو رہنمائی کی کون سی راہ باز ہو سکتی ہے؟

(و) ول ڈیورانٹ نے "تمدن کی کہانی" میں لکھا ہے کہ "تاریخ انسانی تمدن کے کمال و زوال اور جائزہ و مطالعہ کا نام ہے"۔ اس بنا پر اگر اسلامی تمدن ہی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا

شکار ہو گیا، اور اسے دفن کر دیا گیا تو تمدن کی اس سے بڑھ کر اور کیا تحقیر ہوگی۔

مستشرقین کے اعتراض و الزام کی ایک نوعیت یہ بھی ہے کہ

(الف) مسلمانوں کی اعتقادی، فکری اور اخلاقی زندگی کو ڈھانے اور اکھاڑنے میں اسکا بڑا حصہ ہے۔ یہ ایسے بہادروں اور لیڈروں کی زندگی کو محبوب بنا کر ان کے سامنے پیش کرتا ہے جن کے اصول و ضوابط اور طور و طریق کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

(ب) یہ موجودہ دنیائے اسلام کا اس کے ماضی سے فکری، شعوری اور تاریخی رشتہ کاٹ کر اسے بہت حقیر و گھٹیا بنا کر پیش کرتا ہے، حالانکہ مستشرقین کو معلوم ہے کہ جدید اسلامی فکر اسی اسلامی فکر کا ثمرہ اور نتیجہ ہے، جس کی بنیاد قرآن اور رسول کی تعلیمات نے رکھی ہے۔

(ج) یہ انسانی زندگی کے اُس روحانی پہلو کو مسمار کر دیتا ہے جس کا سب سے اعلیٰ اور مکمل نمونہ مسلمانوں کے رہنما اور پیغمبر کی زندگی میں تھا۔ اور اسے تاریخ کے خوبصورت فریم اور چوکھٹے میں منجمد کر دیتا ہے۔

(د) وہ جہاد اور احکام اسلامی کو ناقابل عمل اور مشکل بتاتا ہے اس بنا پر فکری و عملی زندگی کی تجدید اور نشاۃ ثانیہ کا نعرہ بلند کر کے مسلمانوں کی امیدوں کو خاک میں ملا دیتا ہے۔

(ہ) وہ ایسے رہنماؤں اور قائدوں کو نمایاں اور ممتاز قرار دیتا ہے جو رسول اللہ کے قائدانہ اوصاف اختیار کرنے کے بجائے فکری، اعتقادی اور اجتماعی حیثیت سے مغربی قائدین کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

(و) انور جندی نے ان گوناگوں خطرناک شبہات کی خصوصیات کی نشاندہی کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ مغرب کا سب سے خطرناک ارادہ اور منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا دل و دماغ توحید، اخلاق، روحانیت اور ایمان سے عاری ہو کر اس تیز و تند ہوا کے سامنے آجائے جو تعلیم،

صحافت، ادب، فلم اور لباس وغیرہ کے راستہ سے زہر بکھیر رہی ہے۔ ان چیزوں کے مسموم اثرات سے ایسی نسل تیار ہو رہی ہے، جو تخریب اور بربادی کی طرف اس کو ترقی و تمدن کا نام دیکر چلی جا رہی ہے۔ اور اسلامی تاریخ و تہذیب اور اس کے اصول و مبادی کو مسخ کر کے مستشرقین و مبلغین کی پیروی کر رہی ہے اور ان ہی کی طرح اس دور کو حقیر اور کمتر خیال کر رہی ہے، جو تاریخ عالم کی نمایاں اور مفید خدمت انجام دے چکا ہے۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں بھی اس کے ناقص اور فروتر ہونے کا احساس و شعور پیدا کر رہی ہے۔

۳۔ اسلام پر الزام تراشی کے اغراض و مقاصد

عیسائی مشنریاں اور استعمار پسند کھل کر مسلمانوں پر اثر انداز اور حاوی ہونے کے درپے ہیں۔ اس کے لیے وہ کانفرنس اور اجتماعی، ادبی اور علمی اجلاس کرتے ہیں لیکن مستشرقین کے اغراض و مقاصد علم و معرفت کے غلاف میں لپٹے ہوتے ہیں۔ صرف کبھی کبھی ان کی غرض و غایت نمایاں ہوتی ہے۔ ان کا نشانہ اسلام کے تمام احکام و مسائل اور اس کی شخصیتیں ہوتی ہیں۔ جن میں سرفہرست خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے۔ اسلام کے خلاف طعن و تشنیع اور افترا پردازی کے پیچھے جو جذبات و مقاصد کارفرما ہیں ان کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

۱۔ نصرانی قبائل اور اسلام کے درمیان حائل ہونا

اسلام کو مسخ کرنے اور اس کے محاسن پر پردہ ڈالنے سے ان کا ایک خاص مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ اسلام میں نظام حیات بننے کی صلاحیت نہیں۔ صلیبی جنگوں کے بعد ہی سے یہ بات دہرائی جا رہی ہے قرآن مجید کے ترجمے بھی یہی ثابت کرنے اور اس کے اندر نقص نکالنے کے لئے کئے گئے ہیں۔ اہل یورپ کے اندر عثمانیوں کے یورپ پر چھا جانے کے بعد اسلام کے خلاف کراہیت، نفرت اور ذہنی جنگ کی مستقل فضا پیدا کر دی گئی ہے۔ اور اسلام کے نافذ العمل ہونے کے بارہ میں انھیں شکوک و شبہات میں

ڈال دیا گیا ہے۔

۲۔ مسلم ممالک کو نوآبادیات بنانے کی سازش

دوسری غرض یہ تھی کہ جہاد کی تاویل و توجیہہ کر کے مسلمانوں کو اس کی جانب سے غافل کر دیا جائے اور انھیں عافیت و آرام پسندی کا درس دیا جائے تاکہ اسلام کی قوت مقابلہ پاش پاش ہو جائے۔ اور جنگ و جہاد کی خوگر قوم کو عبادت و ریاضت میں مشغول کر کے یہ باور کرایا جائے کہ جہاد اکبر یہی ہے۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا گیا۔ اور اسلامی سلطنتوں کے حصے بخرے کر دیئے گئے، مسلمانوں کی سوسائٹی سے معاشرت و سیاست کے اسلامی قوانین معطل کر دئے گئے اور مغرب کا مکمل تسلط قائم کرنے کے لئے اسلام کے قانونی، سیاسی اور تمدنی نظام میں خلل ڈال دیا گیا۔

۳۔ مسلمانوں کو ان کی اصل بنیادوں اور سرچشموں سے دور کر دینا

اسلام کے اصول تبدیل کر کے مسلمانوں کو ان کے سرچشموں سے دور کر کے اور ان کی انفرادی، اجتماعی، نفسیاتی اور عقلی خصوصیات ختم کر کے انھیں استعماری فکر و تہذیب کے سامنے سرنگوں کر دیا گیا۔ اس طرح مسیحی تبلیغ و دعوت کو ان کے عقائد و نفوس میں پیوست کرنے کا دروازہ کھل گیا۔ اور بہت سے کمزور عقیدہ کے لوگ الحاد میں مبتلا ہو گئے۔

۴۔ دنیائے اسلام کو کمزور اور پسماندہ بنانے کی اسکیم

مستشرقین عالم عرب اور دنیائے اسلام کو پس ماندگی اور بدحالی سے ہمکنار کر کے اس پر اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔ اور پھر مسلمانوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ ان کی پس ماندگی کا سبب اسلام کی پیروی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا ہے۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے اسلام، اسلامی اصول و قوانین، اس کے تصور عبادت، نظام اور تاریخ کے بارہ میں بے شمار شبہات و الزامات گڑھے ہیں۔ استعمار پسندوں کا یہ دعویٰ بالکل کھوکھلا ہے کہ عربوں اور مسلمانوں کے تنزل و انحطاط کی وجہ اسلام ہے، علم و تاریخ کی میزان اور کسوٹی پر

پر کھنے کے بعد اس کا کھوٹ بالکل واضح ہو جاتا ہے، اس لئے صحیح تو یہ ہے کہ بنیادی طور پر عربوں اور مسلمانوں کا انحطاط اسلام سے انحراف کا نتیجہ ہے اگر اسلام کے درست نظریے اور بنیادی اصول کو وہ اختیار کئے ہوتے تو اس مشکل میں نہ پھنستے۔

ایک طرف تو یہ حال ہے۔ اور دوسری طرف اکثر اہل مغرب مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اور فکری و مادی قوت کے دوبارہ عود کرنے سے خائف اور لرزہ بر اندام ہیں، انھیں اندیشہ ہے کہ اسلام اور اس کے امتیازی اصول و تشخصات مغربی دنیا کا استیصال کر دیں گے۔ اور مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ معمورۂ ارضی کے دور دراز گوشوں تک وسیع ہو جائے گا۔ لارنس براؤن کہتے ہیں "مغربی استعمار کے لئے اصلی خطرہ اسلام اور اسلامی نظام کے احیاء میں پوشیدہ ہے۔ کیونکہ اس کے اندر چھا جانے اور سب کو سرنگوں کر دینے کی صلاحیت موجود ہے۔ انور جندی لکھتے ہیں "یہ کہنا بجا ہے کہ اگر ہم اسلام کے اصول و مناہج کو مضبوطی سے اختیار کر لیں، اپنی قدر و قیمت کو پہچان لیں اور اپنے امتیاز و تشخص کو برقرار رکھیں تو ہم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا، ہمارا وجود استعماری اور نو آبادیاتی دور میں اور اس کے بعد بھی صرف عدہ فریم میں بند رہا، اور موثر اور موزوں نہ بن سکا۔

۵۔ سنت نبوی کو عضو معطل کر دینا | مستشرقین کی یہ کوشش بھی ہے۔ اور وہ اسے لوگوں کی نظر میں صحیح ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و توجیہات اور آپ کی قیادت و رہنمائی دور جاہلیت کی برائیوں اور خرابیوں کی اصلاح کے لیے تو موزوں اور مناسب تھی ۔ لیکن اب یہ مرحلہ ختم ہو چکا ہے، دور حاضر کی اخلاقی و اجتماعی قیادت اور اعتقادی اصلاح کے لیے اسلام کو گھسیٹنا درست نہیں، کیونکہ دونوں زمانے میں بڑا فرق ہے، وہ احادیث کے خلاف افترا پردازی کر کے مسلمانوں اور عربوں کو بھی ان کی جانب سے بدگمان

کر دیتے ہیں۔ جو نیبل احادیث کو ہدف بنا کر ان کے تناقض کے متعلق لکھتا ہے۔ "زمانہ کے ساتھ ساتھ رسول اللہ کی مرویات کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، مسلمانوں کا ہر فرقہ اپنی تائید کے لئے احادیث گڑھتا رہا...... اس طرح ہر شخص کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی رائے کو کسی نہ کسی حدیث کے موافق ثابت کر دے، یہی وجہ ہے کہ موضوع و متناقض حدیثوں کی کثرت ہے اور آنحضرتؐ کی ایک ہی سنت کے بارہ میں سخت متضاد حدیثیں پائی جاتی ہیں"

احمد شاکر مرحوم نے اس اعتراض کا بہت طویل جواب دیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ وضاعین وکذابین کی وضع و افترا سے انکار نہیں...... یہ بھی تسلیم ہے کہ سچے راویوں کی بعض حدیثوں میں غلطیاں موجود ہیں۔ خود علمائے فن اور محدثین نے ان کی حقیقت واضح کر دی ہے۔ لیکن مقالہ نگار نے احادیث کی جو یہ تصویر پیش کی ہے کہ حلال و حرام اور طہارت و نظافت کے تمام مسائل ہی موضوع حدیثوں پر مبنی ہیں۔ اس سے تو اس کا سارا ذخیرہ ہی باطل اور مردود قرار پاتا ہے۔ اور اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے نہ کچھ فرمایا اور نہ کچھ کیا"

احادیث پر ان کی بہتان تراشی کے نمونے یہ بھی ہیں کہ بعض حدیثیں انجیل کی تعلیمات سے ماخوذ ہیں۔ آپ نے آبا و اجداد کے طور طریقے بدل کر کچھ نئے طور طریقے جاری کر دئے، اسی طرح انھوں نے آپ کی نبوت میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لیے آپ کے ان اقوال کو بہت نمایاں کیا ہے۔ جن میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ انھیں طعن و تشنیع کا نشانہ بنائیں، لیکن ہمارے علمائے محققین نے مدلل طور پر ان افترا پردازیوں کا جواب دیا ہے۔ اور علمی انداز میں مستشرقین کے باطل خیالات کی تردید کی ہے۔

۶۔ شبہات و اعتراضات کا محور و مرکز | مستشرقین کے سارے الزام کا محور دو ہے (۱) محمدؐ نبی اور رسول نہیں تھے۔ بلکہ محض ایک انسان تھے (۲) اسلام انسانی نتیجۂ فکر اور ذہنی اختراع ہے،

وحیِ الٰہی نہیں ہے۔

اس معاملہ میں سب مستشرقین برابر اور یکساں ہیں۔ خواہ وہ آپؐ کو ایک اجتماعی مصلح، منفرد عبقری، بے مثال بہادر اور انسانیت کا قائد و رہنما سمجھتے ہوں یا آپ کو گھناؤنی عادتوں مکر و فریب، پُرخوری، ہوس رانی شہوت، بزدلی، سنگ دلی، سفاکی اور خون ریزی سے متہم کرتے ہوں اور یہ کہتے ہوں کہ آپؐ گذشتہ آسمانی کتابوں کی پیروی کرتے تھے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو ایجابی یا سلبی نظر سے دیکھنے والے مستشرقین بھی برابر ہیں، نیز جو آپ کی شخصیت کو اعتدال و انصاف کی میزان میں تولتے ہیں۔ اور جو بھونڈی اور مذموم اغراض کی میزان میں تولتے ہیں سب ہی برابر ہیں۔ کیونکہ یہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جزیرۂ عرب کے ایک فرد تھے اور جس طرح دوسرے اور آخری گروہ سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ مسلمانوں کی طرح آپ پر ایمان لائے گا۔ آپ کو نبی و رسول تسلیم کرے گا۔ اور اسلامی فکر کا حامل ہوگا۔ اسی طرح پہلے گروہ سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی، البتہ مستشرقین کی ایک تیسری جماعت بھی ہے۔ جس کی حق گوئی، اعتراف حقیقت اور انصاف پسندی نے اسے اسلام قبول کرنے اور اسے قولاً و عملاً اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ یہاں تک کہ ان میں سے اکثر تمام فکری دائروں میں اسلام اور نبی اکرمؐ پر ایمان لانے کی دعوت دینے لگے۔

مستشرقین کے بعض اعتراضات کے شروع میں نبوت کے دفاع کا ذکر ہوتا ہے پھر وہ رسول اللہؐ کے نام اور آپؐ کی بعثت سے پہلے اور بعد کی زندگی کو زیر بحث لاکر اسی پہلے محور کے گرد پہنچ جاتے ہیں، ابتدا میں تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر بات کو تسلیم کریں گے اور آپؐ کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر بحث کرکے اس کی گوناگوں خوبیاں اور کمالات واضح کریں گے، مگر اس کے بعد بھی وہ اس امر کا اقرار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور آپؐ پر بھی

اسی طرح وحی نازل ہوئی تھی جس طرح گذشتہ انبیا حضرت ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰ علیہم السّلام پر اتری تھی۔ جن کی نبوت کے یہ لوگ بھی قائل ہیں، بیشک اسی کا نام عصبیت اور جانبداری ہے۔

ان کا دوسرا محور یہ ہے کہ اسلام کسی مصلح یا عبقری شخص کے ذہن کی پیداوار ہے، حالانکہ نامور مستشرقین اور قانون کے ماہرین شاخت وغیرہ کو اعتراف ہے کہ قانونی حیثیت سے اسلام کو رومن لا پر فوقیت حاصل ہے۔ اور وہ اکثر جدید قوانین سے بھی افضل و برتر ہے۔ اسی طرح دین و مذہب کے بعض ماہرین کہتے ہیں کہ اسلام کا عقیدہ توحید واقعیت و حقیقت کے اعتبار سے کسی بھی دوسرے آسمانی عقیدہ و تصور سے ممتاز ہے۔ اسلامی عبادات کے بعض اعمال گو بعض لوگوں کی نظر میں جاہلیت کی یادگار ہیں۔ اور وہ انھیں قدیم مشرقی مذاہب سے ماخوذ سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ مانتے ہیں کہ ان کا خاص مقصد انفرادی و اجتماعی اصلاح ہے۔ رہے اخلاق و معاملات تو بعض لوگ انھی کو اصل اور تمام اسلام قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے اندر انسانیت کی بنیادی قدر و قیمت کی ضمانت ہے۔ جیسے آزادی، عظمت و کرامت احساس ذمہ داری اور زندگی کی محافظت وغیرہ۔ ان حیثیتوں سے اسلام دوسرے مذاہب میں منفرد ہے۔ اسی طرح اسلام کے اقتصادی، سیاسی، خاندانی اور اجتماعی نظام، قانون قضا اور نظم مملکت سے بھی اس کا بہت روشن پہلو سامنے آتا ہے، اور اسلام اپنے اسی تمدن و شائستگی کی وجہ سے گذشتہ زمانہ میں زمین پر حکمرانی کرتا رہا ہے اور اب بھی اس میں زندگی اور نمو کی صلاحیت رکھنے والی ایسی قدریں ہیں۔ جن کی بدولت وہ از سر نو زمین پر حکومت اور فرمانروائی کرے گا۔

یہی وہ محور و مرکز ہیں۔ جہاں سے پھر الزامات کا رخ سیرت نبوی کی جانب مڑ جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں بھی ہم مستشرقین کے ان دونوں گروہوں کو برابر سمجھتے ہیں۔ جو اسلام کے اوصاف و محامد بیان کرتے ہیں یا اس کے معائب و مثالب کی کرید کرتے ہیں اور اس پر تنگ، آزادی اور کھلی چھوٹ دینے، غلامی کی داغ بیل ڈالنے، عورتوں کے حقوق غصب کرنے، رحم و شفقت سے عاری ہونے اور اسی نوعیت کے بہت سارے اسلام کے اصول و قوانین سے میل و مطابقت نہ رکھنے والے الزامات عائد کرتے ہیں۔

اب ہم ان کے سیرت نبویؐ پر بعض اعتراضات کا جائزہ لیں گے۔

آپؐ بحیثیت آدمی کے اعتراضات | مستشرقین کی جانب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف نوعیت کی تہمتیں لگائی گئی ہیں، سب سے پہلے آدمی کی حیثیت سے آپ پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(الف) پُرخوری کا الزام | لامانس کہتا ہے۔ "آپ بڑے پُرخور تھے، آپ کا جسم لذیذ اور مرغوب کھانوں کی وجہ سے بھاری اور موٹا ہو گیا تھا۔" مگر کھانے کے بارہ میں آپ کے جو عام اور مشہور آداب بیان کئے گئے ہیں۔ اور جو مورخین کے نزدیک بھی ثابت و تسلیم شدہ ہیں۔ یہ قول ان کے بالکل برعکس ہے۔ آپؐ کی حالت تو یہ تھی کہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے مگر کبھی جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔ پانی اور روٹی ہی اکثر آپؐ کی غذا ہوتی تھی، انھیں آپ اسودین[1] کہتے تھے، حافظ ابن قیم جوزی فرماتے ہیں۔ کھانے میں آپؐ کا معمول اور عادت مبارکہ یہی تھی کہ موجود کو مسترد نہ کرتے اور غیر موجود کے لئے زحمت نہ دیتے، جو میسر ہوتا اسے تناول فرماتے، ورنہ صبر کرتے، بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھ لیتے، مہینوں گذر جاتے اور آپؐ کے گھر میں آگ بھی نہ جلتی، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے مقدامؓ بن معدی کرب کی یہ روایت نقل کی ہے، اور اسے حسن بتایا ہے۔ اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ آدمی کے لئے

[1] اسودین سے پانی اور کھجور مراد ہے۔

پیٹ بھرنے سے زیادہ خراب کوئی اور برتن بھرنا نہیں ہے، اس کے لئے چند لقمے کافی ہیں۔ جو اسکی پیٹھ کو سیدھی رکھیں، اگر کوئی شخص اپنے نفس سے مغلوب ہو جائے تو ایک تہائی پیٹ میں کھانا کھائے، ایک تہائی میں پانی پیئے اور ایک تہائی پیٹ خالی رہنے دے، امام بخاری کی صحیح میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ وہ کچھ لوگوں کے پاس سے گذرے جن کے سامنے بھونی بکری تھی، لوگوں نے ان سے کھانے کی فرمائش کی مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ رسول اللہؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے، اور کبھی انھوں نے شکم سیر ہو کر جو کی روٹی بھی نہیں کھائی، وہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ کے مدینہ تشریف لانے کے بعد آل محمدؐ نے کبھی مسلسل تین رات گیہوں نہیں کھایا یہاں تک کہ آپ کی وفات ہو گئی۔

اس سے قطع نظر معترض نے رسول اللہؐ کے ماہ رمضان میں روزہ رکھنے کا کوئی ذکر نہیں کیا حالانکہ آپ رمضان کے علاوہ دوسرے مہینوں میں بھی روزے رکھتے تھے اور پیر اور جمعرات کو تو عموماً روزے سے ہوتے تھے، کبھی کبھی روزے رکھنے پر آتے تو لوگوں کو خیال ہوتا کہ آپ افطار نہ کریں گے، اسی طرح رمضان میں صوم وصال کا اہتمام فرماتے تھے، یعنی دو یا کئی کئی دنوں تک مسلسل روزے رکھتے اور شب میں بھی کھانا پینا ترک کر دیتے تاکہ رات و دن کے بیشتر اوقات عبادت میں گذاریں، مگر صحابۂ کرام کو اس سے منع کرتے، انھوں نے عرض کیا آپ تو ایسا کرتے ہیں، فرمایا میں تمھاری طرح نہیں ہوں، میرا خداوند مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آپ کو علوم و معارف کی غذا عطا کی جاتی ہے، اور آپؐ کے دل پر مناجات کی لذتوں کا فیضان ہوتا ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت انسؓ سے اس روایت کی تخریج کی ہے کہ رسول اللہؐ مہینہ کے بعض حصوں میں افطار سے ہوتے تو معلوم ہوتا کہ آپ روزہ ہی نہ رکھیں گے۔ اور روزہ رکھنے لگتے تو خیال ہوتا تھا، کہ اب آپ افطار سے نہ ہوں گے اسی طرح شعبان میں بھی اکثر روزے سے رہتے تھے، اس کے بعد پرخوری کا الزام کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ (باقی)

بنگال کی پہلی فارسی تالیف

از

پروفیسر کلیم سہسرامی، راجشاہی یونیورسٹی، راجشاہی (بنگلادیش)

بنگال اگرچہ اردو، فارسی کے مرکز دلی اور لکھنؤ سے کافی دور ہے، لیکن تقریباً ساڑھے سات سو برس تک فارسی یہاں کی سرکاری زبان تھی، اس طویل عرصے میں فارسی نظم ونثر کی سیکڑوں علمی وادبی کتابیں قابل قدر شخصیتوں کے قلم سے وجود میں آئیں، یہاں اس اجمال کی تفصیل کا موقع نہیں، کیونکہ اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو ایک مستقل کتاب مرتب ہو جائے، بہرکیف یہاں فارسی کی سب سے پہلی کتاب جس کا سراغ اب تک لگ سکا ہے، اس کا نام حوض الحیاۃ ہے، اس کا اصل متن سنسکرت زبان میں امرت کنڈ کے نام سے موجود ہے، جو ساتویں صدی ہجری قمری / تیرھویں صدی عیسوی میں سنسکرت زبان سے براہ راست ترجمہ کیا گیا،[1] اس کے مترجم بنگال کے قدیم دار السلطنت لکھنوتی (گوڑ) کے جج قاضی رکن الدین محمد سمرقندی تھے[2]، قاضی صاحب نے ایک ہندو جوگی بھوجر برہمن کی مدد سے علی مردان خان کے دوران حکومت (۶۰۷ - ۶۱۰ / ۱۲۱۰ - ۱۲۱۳) میں یہ علمی خدمت انجام دی، اس کتاب کا موضوع ہندوؤں کا فلسفۂ ریاضت ہے، جسے ہندی میں جوگ اور سنسکرت میں یوگ کہتے ہیں، اس کتاب میں ریاضت کے مختلف عملیات بیان کیے گئے ہیں، مؤلف کے قول کے مطابق اس میں بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کرنے سے ایک شخص روحانیت

کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہو سکتا ہے، یہ کتاب حیات وموت کی مختلف منزلوں اور طبیعیات وما بعد الطبیعیات کی دنیا کے متنوع مسائل کی تشریحات پر مشتمل ہے، قاضی رکن الدین محمد سمرقندی نے خود تجربے کے طور پر ان عملیات کی ہدایت کے مطابق ریاضت کی، اور روحانیت کے مدارجِ اعلیٰ پر فائز ہوئے،

حوض الحیاۃ بیاسی (۸۲) صفحے پر مشتمل ایک مختصر سا رسالہ ہے، جس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے:

باب اول در معرفت عالم صغیر وماہیت آن، باب دوم در معرفت تاثیرات عالم صغیر، باب سوم در معرفت کیفیت دل وحقیقت ارادات وتخیلات، باب چہارم در معرفت ریاضت وکیفیت آن، باب پنجم در معرفت ایجاد انسان وانواع دم، باب ششم در معرفت چگونگی جسد وماہیت آن ومحافظتِ منی، باب ہفتم در معرفت وہم، باب ہشتم در معرفت فساد جسد وظاہر شدن علامت مرگ، باب نہم در معرفت تسخیرات روحانیت، باب دہم در معرفت حکایت مبدا ومعاد،

بعد میں انہی قاضی رکن الدین محمد سمرقندی نے اس کتاب کے فارسی متن کا عربی میں ترجمہ کیا، عربی متن کے دیباچے سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے، کہ ایک شخص بھوجر برہمن کامروپ (آسام) سے لکھنوتی پہنچتا ہے، اور قاضی صاحب مذکور کے ساتھ جمعہ کے دن مذہبی مناظرہ کرتا ہے، مناظرے کے دوران قاضی صاحب کے علمی ادراک اور روحانی اکتشاف سے متاثر ہو کر یہ برہمن اسلامی تعلیمات کا گرویدہ ہو جاتا ہے، اور ان کے دست مبارک پر اسلام قبول کر لیتا ہے،

قاضی رکن الدین محمد سمرقندی جیسے صاحب علم وفضل کی رہنمائی میں بھوجر برہمن نے اسلامی تعلیمات کی تکمیل کی اور اپنے علمی اور دینی تبحر کی بدولت لکھنوتی کا مفتی مقرر ہوا،[3] اور

اسلامی قانون کے مطابق نہایت دانشمندی کے ساتھ فتویٰ صادر کرنے کے فرائض انجام دینے لگا۔ اس سلسلہ میں یہاں حوض الحیاۃ کے دیباچے کے عربی متن کا اقتباس[۵۵] پیش کیا جاتا ہے، جس سے قاضی رکن الدین محمد سمرقندی اور بھوجر برہمن کے درمیان مذہبی مناظرے کی تفصیل پر روشنی پڑتی ہے:

فان فی بلاد الهند کتاب
معتبر معروف عند حکمائها
وعلمائها وهو یسمی امرت
کند یعنی حوض ماء الحیاة
فلما فتح المسلمین (المسلمون)
لبلاد الهند وظهر فیها علم
الاسلام بلغ الخبر الی کابر
(کامر) وهی اقصی بلاد الهند
وفیها علمائها وحکمائها فخرج
واحد منهم لطلب المناظرة
مع علماء الاسلام واسمه
بهوجر برهمن جوکی معناه
بالعربیة مرتاض عالم، حتی
وصل الی لکنوت فی وقت
السلطان علی مردان فی بنکالہ

ہندوستان میں ایک قابل اعتبار
کتاب ہے، جس سے وہاں کے عالموں
اور دانشوروں کا پتہ چلتا ہے،
اس کتاب کا نام امرت کنڈ ہے،
یعنی حوض الحیاۃ، جب مسلمانوں نے
ہندوستان کو فتح کیا، اور یہاں
اسلام کا جھنڈا لہرایا تو یہ خبر کامرو
آسام تک پہنچ گئی، کامروپ
ہندوستان کے دور دراز علاقے
میں ہے، جہاں بہت سارے دانشور
اور عالم تھے، ان میں سے ایک عالم
علمائے اسلام کے ساتھ مناظرہ کے
لیے روانہ ہوا، اس کا نام بھوجر برہمن
تھا، یہ شخص جوگی تھا، جسے عربی میں
مرتاض عالم کہتے ہیں، یہ شخص سلطان

بنغال، فدخل الجامع یوم
الجمعة فسأل عن العلماء
فاشاروا الی محل القاضی الامام
رکن الدین محمد السمرقندی
فقال: من امامکم؟ فقال
محمد صلی الله علیه وسلم رسول الله
فقال: من الذی، قال فی
الروح هو من امر ربی. فقال:
صدقتم هذا الذی وجدنا
فی مصحف ابراهیمنا وهما
ابراهیم وموسی علیهما
السلام، فاسلم وتعلم علوم
الاسلام، حتی اجاز له العلماء
الفتوی وعرض هو هذا الکتاب
علی القاضی المذکور علیه الرحمة
فتعجب من ذالك وعمل فیه حتی
وصل الی مرتبتهم فنقله من الهندیة
الی الفارسیة ومن الفارسیة الی العربیة
وهو عشر ابواب[۵۶]

علی مردان خان کے زمانہ میں بنگال
کے دار السلطنت لکھنوتی پہنچا، اور
جمعہ کے دن جامع مسجد میں داخل
ہو کر وہاں کے علما کے متعلق
دریافت کیا، لوگوں نے اسے قاضی
رکن الدین محمد سمرقندی کے مکان
کا پتہ بتا دیا، اس جوگی نے ان سے
پوچھا کہ آپ کا پیشوا کون ہے؟
قاضی صاحب نے جواب دیا کہ محمد
صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ کے رسول
ہیں، پھر پوچھا وہ کون ہیں؟ قاضی
صاحب نے فرمایا کہ وہ جنھوں نے کہا ہے کہ
روح میرے رب کے امر سے ہے، جوگی نے
کہا کہ آپ سچ فرماتے ہیں، میں نے ان
کے بارے میں حضرت ابراہیم اور
حضرت موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں
میں ایسا ہی پایا ہے، اسکے بعد اس نے
اسلام قبول کر لیا، اور علوم اسلامی
میں اس حد تک دستگاہ پہنچائی کہ علما

نے اسے فتویٰ دینے کی اجازت دیدی۔
اس جوگی نے یہ کتاب قاضی صاحب مذکور
کی خدمت میں پیش کی، اسے دیکھ کر قاضی
صاحب کو تعجب ہوا، چنانچہ اس میں
جو عملیات بتائے گئے تھے، قاضی صاحب نے
ان پر عمل کیا، یہانتک کہ وہ بھی ہندوستان
کے عالموں اور دانشوروں کے مرتبے
کے برابر پہنچ گئے، یہ کتاب ہندی سنسکرت
سے فارسی میں اور فارسی سے عربی میں
ترجمہ کی گئی، جس میں دس باب ہیں۔

حوض الحیاۃ کا عربی متن فرانسیسی زبان کے مجلہ ایشیاٹک ۱۹۲۸ء میں شایع ہو چکا ہے، جس کے دس باب کی تفصیل یہاں درج کی جاتی ہے:

الباب الاول فی معرفۃ کیفیۃ العالم الاصغر، الباب الثانی فی معرفۃ کیفیۃ التاثیرات التی فی العالم الصغیر، الباب الثالث فی معرفۃ کیفیۃ القلب وحقیقۃ معناہ الباب الرابع فی کیفیۃ (معرفۃ) الریاضۃ، الباب الخامس فی معرفۃ النفس و کیفیتہا، الباب السادس فی معرفۃ محافظۃ المنی، الباب السابع فی معرفۃ کیفیۃ الوھم، الباب الثامن فی معرفۃ علامات الموت وکیفیۃ دفعہا، الباب التاسع فی معرفۃ تسخیر الروحانیات، الباب العاشر فی کیفیۃ (معرفۃ) تتمۃ الحکایۃ

عربی متن کا اختتام اس طرح ہوتا ہے:

"تم الکتاب بعون الملک الوھاب کتاب مختصر حوض الحیاۃ للسمرقندی"۔

امرت کنڈ کا دوسری بار عربی ترجمہ ایک دوسرے برہمن امبھاوناتھ کے تعاون سے کیا گیا، اس برہمن کا تعلق بھی کامروپ یعنی آسام سے تھا، اس عربی ترجمے کے اصل مترجم کا نام معلوم نہیں، لیکن مشہور مستشرق براکلمن کے خیال میں اس کے مترجم مشہور عالم ابن عربی تھے، مذکورہ عربی ترجمے کا عنوان "کشف الظنون" میں اس طرح درج ہے، "مرآۃ المعانی فی ادراک العالم الانسانی"

ڈاکٹر حبیب اللہ سابق صدر و پروفیسر شعبۂ تاریخ و تمدن اسلام ڈھاکہ یونیورسٹی کے خیال میں قاضی رکن الدین محمد سمرقندی کے پہلے عربی ترجمے کے بعد ابن عربی نے تقریباً بیس سال کے اندر اس کتاب کا دوسرا عربی ترجمہ کیا، دوسرے عربی ترجمے نے فلسفیوں اور دنیائے اسلام کے عالموں کے نزدیک بہت زیادہ شہرت پائی، چودھویں صدی عیسوی/آٹھویں صدی ہجری قمری کے مشہور مصری صوفی محمد غلی کو اس کتاب کا علم تھا، ان کے خیال میں اس کتاب کا موضوع ہندوستانی فلسفۂ تصوف ہے۔

یہاں یہ بات توجہ طلب ہے کہ شیخ محی الدین ابن عربی کا انتقال (۶۳۸ھ ہجری قمری، ۱۲۴۰ء عیسوی) میں یعنی قاضی رکن الدین محمد سمرقندی (متوفی ۶۱۵ھ ہجری قمری/۱۲۱۸ء عیسوی) کی وفات کے تقریباً بائیس ۲۲ سال بعد ہوا، اس طرح یہ امکان ہے کہ انھوں نے امرت کنڈ کا عربی ترجمہ کیا ہو، مترجم کا بیان ہے کہ اس کی ملاقات ایک برہمن امبھاوناتھ سے ہوئی، جو کامروپ یعنی آسام سے آیا تھا، اور جس نے سمرقندی کے عربی ترجمے کے کچھ اقتباسات مترجم کو سنائے جو اسے زبانی یاد تھے؛ تاہم مذکورہ بالا بیان کے متعلق شبہات پیدا ہوتے ہیں، جن کی بنیاد حسب ذیل حقائق پر ہے:

(۱) ابن عربی نے کبھی کسی ہندو برہمن امبھاداناتھ سے اپنی ملاقات کا تذکرہ نہیں کیا ہے،

(۲) محی الدین ابن عربی سنسکرت زبان سے واقف نہ تھے۔

(۳) ابن عربی نے کبھی ہندوستان کا سفر نہیں کیا، اس لیے امبھاداناتھ برہمن سے ان کی ملاقات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(۴) ہندوستان یا ہندوستان سے باہر محی الدین ابن عربی اور امبھاداناتھ کی ملاقات کا حوالہ کسی کتاب میں نہیں پایا جاتا۔

اس لیے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ممکن ہے کسی اور شخص نے قاضی رکن الدین محمد سمرقندی کی وفات کے بعد امرت کنڈ کا دوسرا عربی ترجمہ کیا ہو، اور اسے شہرت دینے کے لیے ترجمے کو ابن عربی سے منسوب کر دیا ہو[12]۔

گیارہویں صدی ہجری قمری / سترہویں صدی عیسوی کے ایک ممتاز عالم محسن فانی نے بھی اپنی مشہور کتاب دبستان مذاہب میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم نے اپنے مضمون مطبوعہ مجلہ ایشیاٹک میں لکھا ہے کہ شیخ محمد غوث گوالیاری اس بات کے مدعی ہیں کہ انھوں نے امرت کنڈ کا ترجمہ براہ راست سنسکرت سے فارسی میں بحر الحیات کے نام سے کیا ہے، شاہ صاحب کا دعویٰ ہے کہ ان کا اپنا فارسی متن اور محی الدین ابن عربی کا عربی متن قاضی رکن الدین محمد سمرقندی کے فارسی و عربی متن سے بعض نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہے[13]، اگرچہ بحر الحیاۃ کے فارسی ترجمے سے متعلق محققین میں اختلاف رائے ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ خیال اوروں کی بہ نسبت زیادہ قرین قیاس ہے کہ شیخ محمد غوث گوالیاری اپنے بڑے بھائی شیخ بہلول کے ہمراہ جو شہنشاہ ہمایوں کے مرشد روحانی تھے، گوڑ (بنگال) تشریف لائے تھے، گوڑ کے قیام کے

زمانے میں اس کا امکان ہے کہ شیخ مذکور نے قرب و جوار کے مقامات کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوگا، جس سے فطری طور پر انھیں خواہش ہوئی ہوگی کہ ان مقامات کی سیر کی جائے، بہرکیف وہ کامروپ (آسام) تشریف لے گئے، اور چند سال وہاں رہ کر سنسکرت زبان ہی نہیں بلکہ ہندو فلسفہ، ریاضت و عبادت کے طریقے بھی سیکھے، جن کا اس زمانہ میں وہاں بہت چرچا تھا، اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شیخ مذکور صرف اسلامی تصوّف ہی سے واقف نہ تھے، بلکہ ہندوستانی یوگ منتر کے طریقے سے بھی بخوبی شناسا تھے، ممکن ہے ان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ امرت کنڈ کا فارسی ترجمہ کر دیا جائے، کیونکہ ہندو فلسفہ و تصوف کی دنیا میں اسکی بہت اہمیت ہے۔

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کا خیال ہے کہ "امرت کنڈ کے پہلے فارسی متن کو پیش نظر رکھ کر بحر الحیات کا موجودہ متن شیخ کے ایک شاگرد نے ان کے بتائے ہوئے الفاظ میں قلم بند کر دیا، شیخ کے اس شاگرد کا نام حسینی گوالیاری ابن محمد باشندۂ سارن تھا، چنانچہ اس کی ترتیب کا زمانہ ۹۶۵ھ / ۱۵۵۷ء متعین کیا جا سکتا ہے[15]۔"

انڈیا آفس لائبریری کے فارسی مخطوطات کے فہرست نگار ہرمان ایتھے کا خیال اختر جوناگڑھی کے بالکل متضاد ہے، یعنی وہ شیخ کے مرید حسینی گوالیاری بن محمد باشندۂ سارن کو ان کا مترجم ثانی تصور کرتا ہے، اس کے قول کے مطابق شیخ غوث گوالیاری نے مذکورہ کتاب امرت کنڈ کا فارسی ترجمہ بحر الحیات کے نام سے اپنے مرشد روحانی حسینی گوالیاری بن محمد سارنی حسینی کے ایما پر کیا، اس سے قبل ایک برہمن جس کا نام کناما تھا، اس کے تعاون سے امرت کنڈ کے سنسکرت متن کا عربی ترجمہ تیس باب میں ہوا تھا[16]۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ فاضل فہرست نگار نے نہ تو اپنا ماخذ بتایا ہے، اور نہ تیس باب کے عربی مترجم کا نام لکھا ہے، اس لئے اس کے بیان کے مصدقہ ہونے پر شک و شبہ ہوتا ہے، مثلاً

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ شیخ محمد غوث گوالیاری کے معتقد یا مرید حسینی گوالیاری کو اشتباہاً ان کا مرشد روحانی بتایا ہے، مزید یہ کہ حسینی کے والد کو محمد سارینی لکھا ہے، وہ غالباً کسی غیر معروف مقام سارن کے باشندہ تھے، جیساکہ اختر میاں جوناگڑھی کا خیال ہے، اس لیے سارینی (؟) کی جگہ سارانی لکھنا درست ہے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ کنا ما نام کے برہمن کا تذکرہ امرت کنڈ یا اس کے فارسی و عربی ترجمے کے سلسلہ میں نہیں ملتا۔

(۳) امرت کنڈ کے دونوں ترجمے حوض الحیات اور بحر الحیات میں دس باب ہیں، اور اس کے برخلاف کنا ما برہمن کی مدد سے جو ترجمہ عربی میں کیا گیا ہے، اس میں تیس باب بتائے گئے ہیں، اس تیس باب کا مخطوطات کی کسی فہرست میں تذکرہ نہیں ملتا۔

غلام سرور کے نزدیک بحر الحیات کا شمار شیخ کی تصانیف میں ہوتا ہے، میاں محمد سعید کا خیال ہے کہ بحر الحیات شیخ محمد غوث گوالیاری کی اپنی تصنیف ہے[18]، لیکن ڈاکٹر محمد حبیب اللہ (سابق پروفیسر و صدر شعبۂ تاریخ و تمدن اسلام) ڈھاکہ یونیورسٹی کی رائے میں محمد بن خطیر الدین شطاری نے اپنے مرشد روحانی حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری کے ایما پر امرت کنڈ کا فارسی ترجمہ کیا[19]۔

مسٹر مزمل حق (استاد شعبۂ تاریخ و تمدن اسلام) ڈھاکہ یونیورسٹی کے خیال میں ہندوستان کے تصوف اسلامی کی تاریخ میں محمد بن خطیر الدین نام کی کسی شخصیت کا پتہ نہیں چلتا[20]، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت فریدالدین عطار (متوفی ۱۲۳۰ء) کے شجرے میں ان کا ذکر یوں آیا ہے، مثلاً ابوالمؤید محمد، معروف بہ غوث بن خطیر الدین بن عبداللطیف بن معین الدین قتال بن خطیر الدین بن بایزید بن فریدالدین عطار[21] چنانچہ پروفیسر حبیب اللہ سے یہ اشتباہ

ہوا ہے کہ انھوں نے پورے شجرے پر توجہ نہیں دی، حال آں کہ محمد بن خطیر الدین سے مراد وہی شخصیت ہے جسے بالفاظ دیگر محمد (غوث) بن خطیر الدین کہنا بجا ہوگا، البتہ محمد غوث گوالیاری کو، محمد (معروف بہ) غوث گوالیاری بن خطیر الدین کا مرشد روحانی تصور کرنا درست نہیں، کیونکہ مصنف اور مرشد روحانی دونوں ایک ہی شخصیت ہیں۔

مذکورۂ بالا محققین کے اختلاف کے پیش نظر صحیح معنوں میں یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ بحر الحیات کا اصل مصنف کون ہے؟ ہاں اس سے انکار ممکن نہیں کہ شیخ نے اس کتاب کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا[22]۔

زیر بحث کتاب حوض الحیاۃ کے قلمی نسخے انڈیا آفس لائبریری (شمارہ ۲۰۰۴) اور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، بانکی پور (پٹنہ) شمارہ - ۲۷۱۷ میں موجود ہیں، اور ان میں سے ہر ایک میں دس باب ہیں، راقم حروف کو ایران کے دوران قیام میں تہران یونیورسٹی کے "دانشکدۂ ادبیات و علوم انسانی" کے کتاب خانۂ علی اصغر حکمت میں حوض الحیاۃ کے ایک قلمی نسخے کے دیکھنے کا موقع ملا، اس قلمی نسخے میں بھی دس باب ہیں، اور جیساکہ اس کے ترقیمے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ کربلائے معلّٰی (عراق) میں نقل کیا گیا ہے، اس کے متن کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ نسخہ مصدقہ نہیں ہے۔

امرت کنڈ کے فارسی و عربی ترجمے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ ساتویں صدی ہجری قمری / تیرہویں صدی عیسوی کے ربع اول میں قاضی رکن الدین محمد سمرقندی اور دوسرے مسلمان علماء و فضلاء نے بنگال کی سرزمین کو نہ صرف اپنے علمی و روحانی فیض سے منور کیا بلکہ یہاں کے مذہب ثقافت اور تہذیب و تمدن کو بھی عملی طور پر سمجھا اور معاشرے میں اصلاح کی کوشش کی، اس سلسلہ میں سب سے پہلے البیرونی نے ہماری رہنمائی کی جس کی تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا

حواشی

[1] مولانا اعجاز الحق قدوسی کے خیال میں یہ کتاب چھٹی صدی ہجری قمری/ بارہویں صدی عیسوی میں لکھی گئی، جو درست نہیں، ملاحظہ ہو تذکرۂ صوفیائے بنگال مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۶۵ء صفحہ ۱۸۱، [2] ڈاکٹر محمد عبدالرحیم کے خیال میں قاضی رکن الدین محمد سمرقندی سے مراد مشہور حنفی فقیہ اور صوفی، قاضی رکن الدین ابو حامد محمد بن محمد علی سمرقندی کی ذات گرامی ہے، آپ بنگال کے دار السلطنت لکھنوتی (گوڑ) کے قاضی اور کتاب الارشاد کے مصنف تھے، ان کے خیال میں قاضی رکن الدین محمد سمرقندی نے سلطان علی مردان خان کے عہد میں لکھنوتی کے قاضی کی حیثیت سے کچھ دنوں فرائض انجام دیے، اس کے بعد اپنے وطن بخارا واپس تشریف لے گئے، جہاں ان کا انتقال ۶۱۵ھ / ۱۲۱۵ء میں ہوا، (سوشل اینڈ کلچرل ہسٹری آف بنگال جلد اول، مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۶۵) لیکن اعجاز الحق قدوسی کے خیال میں قاضی رکن الدین سے مراد قاضی رکن الدین ابو حامد ابن محمود بن محمد العمری سمرقندی ہیں، ملاحظہ ہو تذکرۂ صوفیائے بنگال مطبوعہ لاہور صفحہ ۱۷۹

[3] (۱)، ملاحظہ ہو سر جادو ناتھ سرکار کی مرتبہ "تاریخ بنگال" جلد دوم مطبوعہ ڈھاکہ یونیورسٹی صفحہ ۱۸-۲۰ (ب)، ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد عبدالرحیم کی کتاب "سوشل اینڈ کلچرل ہسٹری آف بنگال" جلد اول مطبوعہ کراچی صفحہ ۱۶۴، (ج)، ملاحظہ ہو ڈاکٹر عبدالکریم کی کتاب "سوشل ہسٹری آف دی مسلمس ان بنگال" مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان، ڈھاکہ ۱۹۵۹ء صفحہ ۶۶، لیکن علی مردان خاں کا زمانۂ حکومت حسب ذیل کتابوں میں غلط لکھا گیا ہے:

(ا) "مجلہ ایشیاٹک" فرانس جلد ۲۱۳، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۲۸ء ص ۳۱۱-۳۱۲ (ب) ڈاکٹر

سید سبط حسین رضوی کی غیر مطبوعہ کتاب "شعرائے معاصر فارسی پاکستان" صفحہ ۱۹، (د)، ڈاکٹر ظہور الدین کی کتاب "پاکستان میں فارسی ادب" مطبوعہ یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور صفحہ ۶۱ [4] ملاحظہ ہو ہرمان ایتھے کی انڈیا آفس لائبریری سے متعلق فہرست مخطوطات فارسی، مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۰۳ء جلد اول شمارہ ۲۰۲ صفحہ ۱۱۱۳-۱۱۱۴ [5] (۱)، ملاحظہ ہو محولۂ بالا "تذکرۂ صوفیائے بنگال" مرتبہ اعجاز الحق قدوسی صفحہ ۱۸۱ (ب)، ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد عبدالرحیم کی محولۂ بالا کتاب "سوشل اینڈ کلچرل ہسٹری آف بنگال" جلد اول صفحہ ۱۶۵ [6] مجلہ ایشیاٹک (فرانس) مذکور ص ۳۱۱-۳۱۲، [7] ڈاکٹر عبدالکریم کی محولۂ بالا "سوشل ہسٹری آف دی مسلمس ان بنگال" کا عربی متن اصل متن سے مقابلہ کے بعد تصحیح کر دیا گیا ہے [8] محولۂ بالا مجلہ ایشیاٹک (فرانس) ص ۳۱۸، ۳۴۴ [9] بحوالہ مجلہ ایشیاٹک سوسائٹی (پاکستان) موجودہ بنگلادیش، ڈھاکہ ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۱۳ [10] (۱)، ملاحظہ ہو حاجی خلیفہ کی "کشف الظنون" مطبوعہ مطبع عالم جلد دوم صفحہ ۲۱۴ (ب)، اعجاز الحق قدوسی نے اپنی محولۂ بالا کتاب "تذکرۂ صوفیائے بنگال" صفحہ ۱۸۱ میں کتاب کے عربی ترجمے کا نام مرآۃ المعانی فی ادراک العلم الانسانی لکھا ہے جو عربی قواعد کی رو سے درست نہیں (ج) ڈاکٹر محمد عبدالرحیم نے اپنی محولۂ بالا "سوشل اینڈ کلچرل ہسٹری آف بنگال" جلد اول صفحہ ۱۶۵ میں کتاب کے عربی ترجمے کا نام "کتاب مرآۃ المعانی فی ادراک العلم الانسانی" بتایا ہے جو درست نہیں (د)، ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی نے تہران یونیورسٹی میں "شعرائے فارسی معاصر پاکستان" کے عنوان سے ڈاکٹریٹ کے لیے جو مقالہ داخل کیا ہے، اس میں اس کتاب کے فارسی و عربی ترجمے کا نام "جوگی" لکھا ہے، جو غلط محض ہے، (صفحہ ۱۹ غیر مطبوعہ) (ہ) ڈاکٹر ظہور الدین نے بھی اپنی کتاب "پاکستان میں فارسی ادب" میں اس کتاب کے فارسی و عربی ترجمے کا نام "جوگی" لکھا ہے جو درست نہیں، (صفحہ ۶۱) [11] مجلہ ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان، ڈھاکہ ۱۹۶۰ء، صفحہ ۲۱۳ [12] مجلہ ایشیاٹک (فرانس) محولہ بالا صفحہ ۲۹۳، [13] ماسبق

۱۴؎ مجلہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، جلد اول، ۱۹۵۳ء ص ۵۳، ۱۵؎ ماسبق ۱۶؎ فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس لائبریری مذکورۂ بالا (مرتبۂ ہرمان ایتھے) ص ۱۱۱۳-۱۱۱۴ ۱۷؎ خزینۃ الاصفیاء، جلد دوم، نول کشور پریس ۱۳۳۲ھ ص ۳۳۴ ۱۸؎ دی شرقی سلطنت آف جون پور، کراچی، ۱۹۶۲ء ص ۲۶۳، ۱۹؎ مجلہ ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان (ڈھاکہ) جلد پنجم، ۱۹۶۰ء ص ۲۱۳، ۲۰؎ مجلہ ڈھاکہ یونیورسٹی، جلد نمبر ۳۰، (حصہ "الف") جون ۱۹۸۲ء ص ۵۸ ۲۱؎ گلزار ابرار (قلمی)، ورق ۹۴ - ۲۲؎ تہران یونیورسٹی میں ڈاکٹر محمد ادریس اعوان (پاکستانی)، نے "بحر الحیات" پر ڈاکٹریٹ کے لیے مقالہ لکھا تھا، معلوم نہیں اس کتاب کے اصل مصنف کے متعلق ان کی تحقیق کیا ہے۔

غالب

مدح و قدح کی روشنی میں

مولانا حالی کی بے مثل کتاب یادگار غالب سے لے کر غالب صدی ۱۹۶۹ء تک غالب پر بے شمار کتابیں، مضامین کے مجموعے اور اردو رسالوں کے ایک سے ایک بڑھ کر خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں، اس طرح سے اردو میں غالب پر اچھا خاصا لٹریچر اکٹھا ہو گیا ہے، "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" اسی سلسلہ کی ایک کڑی، اور اپنے موضوع پر بہت اہم اور جامع کتاب ہے، جس میں مرزا غالب کی ولادت ۱۸۶۹ء سے لیکر ۱۹۶۹ء تک پوری ایک صدی میں انکی حمایت و مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اسکا پورا جائزہ لیکر اس پر کمال دیدہ وری کے ساتھ دو جلدوں میں ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے، یہ غالب کے ما لہٗ و ما علیہ کے معلوم کرنے کے لیے بہترین کتاب ہے۔ قیمت جلد اول ۱۸ روپیہ، قیمت جلد دوم ۱۶ روپیہ

(مرتبہ: سید صباح الدین عبد الرحمٰن) "منیجر"

ایک بین الاقوامی سیمینار

کے سلسلہ میں

لندن کی ڈائری

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۳)

انڈیا آفس لائبریری میں سفارت خانہ سے ہم لوگ انڈیا آفس لائبریری چلے گئے، جو اب ۱۹۷ بلیک فرایرروڈ پر ہے، وہاں جناب عبد الرحمٰن بزمی صاحب نے سلیم قریشی صاحب کو پہلے سے میری آمد کی خبر کر دی تھی، وہ اس وقت فارسی، عربی اور اردو کے شعبہ میں ہیں، ان کے پاس پہونچا تو بڑی محبت سے ملے، ان کا اصلی وطن تو انبالہ تھا، مگر اب راولپنڈی میں متوطن ہیں، انڈیا آفس کے فارسی مخطوطات کا کیٹلاگ تو دار المصنفین میں موجود ہے، اردو کا کیٹلاگ نہ تھا، اس لئے اردو کے مخطوطات کے دیکھنے کی خواہش کی، تو سلیم قریشی صاحب بول اٹھے کہ ان کی فہرست تو معارف میں چھپ چکی ہے، اور یہ صحیح ہے کہ حضرت سید صاحب لندن آئے تھے تو انڈیا آفس کے کتب خانہ کا تفصیلی جائزہ لیا تھا، اور یہاں کی کتابوں کی لمبی فہرست نوٹ کر لی تھی، بلوم ہارٹ، جناب سلیم الدین قریشی اور ارسلا سمس ولیم نے مل کر، اور پھر تنہا سلیم الدین قریشی صاحب نے جو فہرستیں تیار کی ہیں، یہ تینوں جلدیں دیکھیں، ان کی قیمت تیرہ پونڈ ہوتی تھی، وہ ادا کر کے خرید لیں، بلوم ہارٹ کی فہرست میں ۲۶۹، دوسری فہرست میں ۱۰۳، اور قریشی صاحب کی تیار کردہ فہرست میں ۱۴۰ کتابوں کا ذکر ہے، اردو کی

کل کتابیں یہاں تیس ہزار ہیں، ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوستان میں اردو کی جو کتابیں چھپی تھیں اُن کا ایک نسخہ
یہاں ضرور آتا تھا، اب نہیں آتا ہے، بلکہ خریدی جاتی ہیں، قریشی صاحب لائبریری کے اس حصہ میں لے گئے
جہاں فارسی، اردو اور عربی کی کتابیں رکھی تھیں، ٹیپو سلطان کے کتب خانہ سے جو کتابیں آئی تھیں وہ دیکھنے
کو کہا، پھر بہادر شاہ ظفر کے کتب خانہ کی کچھ کتابیں دکھائیں، مومن اور نظیر اکبرآبادی کے کلام کے قلمی
نسخے دکھائے، اردو کے جن قلمی نسخوں کا ذکر کیٹلاگ میں نہیں آسکا ہے، ان کو بھی دکھایا، اور جب اوراق
دکھانے لگے تو بہادر شاہ ظفر کا جو نکاح زینت محل سے ہوا تھا، اس نکاح نامہ کی مطلا اور مذہب
تحریر خاص طور سے دکھائی، مگر کلام پاک کے نسخوں کو دیکھنے کا اشتیاق تھا، حضرت عثمان بن عفان رضؓ کے
دست مبارک کا لکھا ہوا خط کوفی میں کلام پاک کے کچھ اوراق دکھائے تو آنکھوں سے لگایا، اور ایسا
معلوم ہوا کہ لندن آنے کی محنت و مشقت وصول ہوگئی، پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت امام حسینؓ
کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے قرآن پاک کے کچھ اوراق بھی دکھائے تو ان کو دیکھ کر اپنی بصیرت اور بصارت
میں کچھ اضافہ پایا، قریشی صاحب نے فردوسی کے شاہنامہ کے مصور نسخے بھی سامنے لاکر رکھ دیئے جن میں
ایرانی مصوری کے اعلیٰ نمونے تھے، ان سے پوچھا کہ اکبرنامہ، آئین اکبری، مہابھارت اور رامائن کے
بھی مصور نسخے یہاں ہیں کہ نہیں، بولے کہ یہ برٹش میوزیم میں ملیں گے، کچھ الماریاں ایسی تھیں جن میں قلمی
نسخے اچھے حال میں رکھے ہوئے نہیں تھے، میں نے پوچھا کہ کیا اب عربی، فارسی اور اردو کے قلمی نسخوں
کی طرف سے توجہ ہٹا دی گئی ہے، فوراً بولے کہ ایسی کوئی بات نہیں، ایک نسخہ کو درست کرنے میں کافی خرچ
ہوتا ہے اور بہت وقت بھی لگتا ہے، ایک مرمت شدہ قلمی نسخہ کو اٹھا کر دکھایا کہ اب Lami-
nation — اوٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے بلکہ کاغذ کو گلا کر پورا صفحہ اس پر چپکایا جاتا ہے کہ موٹی
کاغذ لگانے کی ضرورت نہیں، اس طرح کتاب کی مرمت میں کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے، اسی لئے اور
کتابوں کی مرمت میں تاخیر ہو رہی ہے، اس طریقہ کو شاید Conservation اور

Acidification کہتے ہیں، انھوں نے بتایا کہ اس لائبریری میں تمام زبانوں کی کتابوں کی
تعداد تقریباً ساڑھے تین لاکھ ہے، اخبارات کی جلدیں سات ہزار ہیں، ریکارڈز تو کروروں ہیں، ایسٹ
انڈیا کمپنی کے زمانے کے جو ریکارڈز یہاں جمع کئے گئے ہیں ان کے ذخیرے کو دیکھ کر حیرت ہوئی، انکی
تعداد پونے دو لاکھ بتائی گئی، ہر جگہ کی مصوری کے نمونے بکثرت تھے، یہاں کے ریڈنگ روم میں
بھی گئے، جس میں ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ میزیں اور کتابوں کو سامنے رکھنے کے لئے ریکٹ لگے ہوئے
ہیں، اس لائبریری کی چار منزلیں ہیں، کتابوں کے اقتباس، یا صفحات یا پوری کتاب کے فوٹو لینے کی
ہر قسم کی آسانیاں ہیں، پہلے یہ انڈیا آفس کے دفتر کے ساتھ منسلک تھی، اب کامن ویلتھ ریلیشنز آفس
کے ساتھ ہے، اور برٹش لائبریری بورڈ کے ماتحت ہے۔

یہاں مجھ کو پیاس لگی تو قریشی صاحب ایک جگہ لے گئے، وہاں ایک مشین میں دو پینی ڈالی گئی تو
اس میں سے پلاسٹک کا ایک چھوٹا گلاس نکلا، پھر دوسرا بٹن دبایا گیا تو اس میں پانی بھر گیا، اسی طرح
چائے بھی آگئی، وقت بچانے اور سہولت فراہم کرنے کی جتنی ممکن صورتیں ہیں، لندن میں ہر قدم پر مہیا
کر دی گئی ہیں، انڈیا آفس کی لائبریری کو اتنے تھوڑے سے وقت میں کیا دیکھتا، اس پر ایک سرسری نظر
ڈال کر اس افسوس کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوا کہ اپنی پیاس پانی کے چند قطروں سے بجھائی، دن کے
تین بج چکے تھے، خیال ہوا کہ اگر برٹش میوزیم بند ہو جائے گا تو دیکھ نہ سکیں گے، جہاں میں ٹھہرا تھا،
وہاں سے تقریباً سترہ میل پر واقع ہے، وہاں سے آنا جانا میرے لئے آسان نہ تھا، اس لئے اس کی بھی
ایک جھلک دیکھنے کے لئے وہاں جلد از جلد پہونچا،

برٹش میوزیم | یہاں جناب ڈاکٹر قاضی محمود الحق نے پیشوائی کی، ان کے آبا و اجداد دہلی کے رہنے والے
تھے، وہ وہاں سے امرت سر منتقل ہو گئے تھے، ۱۹۴۷ء کے بعد سے ان کا خاندان سیالکوٹ اور لاہور میں
رہتا ہے، بہت ہی خلیق اور ملنسار تھے، وہیں شبلی کالج کے سابق لکچرار حالی صاحب مرحوم کے بھائی جناب

سید معین الدین شاہ قادری سے ملاقات ہوگئی، جو یہاں مرکزی لندن کے پالی ٹکنک کالج میں اردو پڑھاتے ہیں، ان سے عزیزی فاتح جمالی صاحب سے متعلق دیر تک باتیں کرتے رہے کیونکہ شبلی کالج میں وہ ان کے استاد رہ چکے تھے، قاضی محمود الحق صاحب اپنے دفتر لے گئے، جس میں اردو کی کتابوں کا ایک ڈھیر تھا، دار المصنفین اور معارف کے متعلق انھوں نے جو باتیں شروع کیں تو لائبریری اور میوزیم دیکھنے کا وقت ختم ہوگیا، انھوں نے اصرار کر کے ۹ ستمبر کو لنچ پر بلایا، ان سے معلوم ہوا کہ خلیق انجم صاحب جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند بھی ڈاکٹر صدیق الرحمٰن استاد شعبۂ اردو جواہر لال یونیورسٹی کے ساتھ آئے ہوئے ہیں، وہ دونوں بھی اس روز ہوں گے، وہاں سے نکلا تو جمالی صاحب کے بھائی نے اردو مرکز جانے کا اصرار کیا، وہاں ڈاکٹر خلیق انجم بھی آنے والے تھے، مگر عزیزی محمد فاتح کو واپس ہونے کی جلدی تھی اس لئے وہاں نہ جاسکا۔

ٹیوٹ ٹرین اس روز تمام دن زمین دوز ریل ہی میں عزیزی فاتح کے ساتھ سفر کرتا رہا، بڑی صاف ستھری سجی سجائی ہوئی ریل ہے، بیٹھنے کے لئے بوٹے دار مخملی گدّوں کی بنچیں تھیں، بنچوں کے بیچ میں آنے جانے کے لئے کشادہ جگہیں تھیں، جابجا خوبصورت ڈنڈے آویزاں تھے، اگر بھیڑ ہونے کی وجہ سے کھڑے ہونے کی ضرورت ہو تو یہ پکڑ لئے جائیں، ان گاڑیوں میں دس بجے دن اور شام کو آٹھ بجے تک تو کچھ بھیڑ ہوتی ہے کیونکہ یہ وقت لوگوں کے کام پر جانے اور آنے کا ہوتا ہے، مگر ہر پانچ منٹ کے بعد دوسری گاڑی پہنچ جاتی ہے، تو یہ بھیڑ زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتی، آرام سے جگہ ملتی رہتی ہے، ہر دو یا تین منٹ کے بعد یہ کسی اسٹیشن پر رکتی ہے، اور مشکل سے آدھا یا پون منٹ رکتی ہے، اور مسافر بھی عجلت کے ایسے عادی ہیں کہ اس مختصر سے وقت میں آسانی سے اترتے اور چڑھتے رہتے ہیں، دروازے گاڑی کے رکنے سے خود کھل جاتے ہیں، اور جب گاڑی روانہ ہونے لگتی ہے تو یہ خود بند بھی ہو جاتے ہیں، کھڑکی پر بکنگ کلرک سے جس اسٹیشن کا ٹکٹ مانگا جاتا ہے، وہ بٹن دباتا ہے، اور ٹکٹ کھڑکی سے باہر نکل آتا ہے، اسی طرح وہ ریزگاری

بھی واپس کرتا ہے، ڈبے میں بڑی خاموشی رہتی ہے، مسافر یا تو اخبار یا کوئی کتاب پڑھتے رہتے ہیں، یا خاموش رہتے ہیں، گاڑی بجلی کی ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے، کرایہ بہت زیادہ ہوتا ہے، ایک گھنٹہ کے سفر کے لئے ایک پونڈ پانچ پینس دینا پڑا، یعنی ہندوستانی سکہ سے تقریباً تیس روپے۔

پھر برٹش میوزیم میں ۹ ستمبر کو میرے دندان ساز نے مجھکو بلایا، کیونکہ میرے بنے ہوئے دانتوں کا سٹ ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا، اس نے اس کو ٹھیک کرنے میں دیر لگائی تو قاضی محمود الحق کے یہاں لنچ پر نہ پہنچ سکا، وہاں عزیزی فاتح کو پہنچانے میں دیر ہوگئی، معلوم ہوا کہ خلیق انجم صاحب برمنگھم کے ایک مشاعرہ کے لئے روانہ ہوگئے ہیں، ان سے نہ ملنے کا افسوس رہا، مگر وہیں دہلی کے مشہور شاعر تاباں صاحب کے صاحبزادے ڈاکٹر اقتدار عالم سے ملاقات ہوگئی، جو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں تاریخ کے استاد ہیں، اپنے ریسرچ کے سلسلہ میں پیرس گئے ہوئے تھے، اب برٹش لائبریری میں کچھ کام کرنے آگئے تھے، یہاں جناب شاہ معین الدین قادری سے پھر ملاقات ہوگئی، تھوڑی دیر کے بعد انڈیا آفس لائبریری سے جناب سلیم قریشی بھی پہونچ گئے، قاضی محمود الحق صاحب تھوڑی دیر کے لئے ایک میٹنگ میں چلے گئے تو مجھکو ریڈنگ روم میں قادری صاحب کے ساتھ بیٹھا گئے، یہ اورینٹل سیکشن کا ریڈنگ روم تھا، برٹش میوزیم ہی کا یہ حصہ ہے، مگر جگہ کی کمی کی وجہ سے اورینٹل سیکشن اب وہاں سے ہٹا کر ۱۴۔ اسٹور اسٹریٹ میں منتقل کر دیا گیا ہے، اور برٹش لائبریری کے نام سے مشہور ہے۔ ساؤتھ ایسٹ ایشیا کی الماریوں پر نظر پڑی تو ان کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا، تو بودھ ازم، ہندو ازم، اسلام، پھر تامل، کناڑی، ہندی اور اردو پر بکثرت کتابیں دیکھنے میں آئیں، ایک سٹ ہسٹری آف انڈین لٹریچر کے سیریز کا بھی دیکھا، جس کے جنرل اڈیٹر جان گھونڈا ہیں، اسی میں اپنی میری شمیل کی ایک کتاب "ہندوستان میں اسلامی لٹریچر" دیکھی تو نکال کر اس پر نظر ڈالی کہ مولانا شبلیؒ اور دار المصنفین کا ذکر کس طرح کیا گیا ہے، لیکن اس میں مولانا شبلی کا ذکر کہیں نہیں پایا، میں نے قاضی محمود الحق صاحب سے اس کا ذکر کیا، تو ان کو پہلے تعجب ہوا، پھر کہنے لگے کہ شمیل نے اردو لٹریچر پر بھی ایک کتاب لکھی ہے

شاید اس میں ذکر ہو، میں نے کتاب دیکھنے کو مانگی، تو اس وقت مل نہ سکی، قاضی محمود الحق صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ میرے پاس اعظم گڈھ بھجوا دیں گے، عزیزی فاتح یہاں پہونچا کر چلے گئے تھے، عزیزی ڈاکٹر جاوید شمیم وہاں مجھکو واپس لے جانے کو پہونچ گئے، پھر ڈاکٹر قاضی محمود الحق نے چائے کی ایک نشست کی جس میں سلیم قریشی اور سید شاہ معین الدین قادری بھی شریک ہوئے، دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، یہ حضرات اپنی میری شمیل کی لیاقت کی گہرائی سے زیادہ متاثر نہ تھے، ان کا خیال ہے کہ وہ ادھر اُدھر سے تھوڑے سے معلومات کو لے کر اپنے خاص انداز میں پیش کرتی رہتی ہیں، اس نشست کے بعد ڈاکٹر قاضی محمود الحق برٹش میوزیم کی اصل عمارت کی طرف لے چلے، ڈاکٹر جاوید شمیم ساتھ رہے، قاضی صاحب نے کہا کہ برٹش میوزیم میں ایک کروڑ تیس لاکھ کتابیں ہیں اور ہر سال پانچ لاکھ کتابوں کا اضافہ اس میں ہوتا رہتا ہے، جب اس کے شاندار ریڈنگ روم میں داخل ہوا تو اس علم و فن کے قلعہ کے اندر آگرہ کا تاج محل اس حیثیت سے ہیچ معلوم ہونے لگا کہ یہاں سے برابر علم و فن کا سرچشمہ جاری ہے، تاج محل دیدہ زیب ضرور ہے، مگر اس سے کیا فیض پہونچا، اس کمرہ میں پڑھنے والوں کی بڑی تعداد دیکھی، قاضی صاحب کہنے لگے کہ جس محنت سے انگریز اپنی صنعت و حرفت کو فروغ دیتے ہیں، اسی مشقت سے علم میں اضافہ کرنے کی فکر میں بھی لگے رہتے ہیں، لائبریری کی کتابوں کی فہرست حروف تہجی کے لحاظ سے چار سو ضخیم جلدوں میں تیار کی گئی ہے، ان کو دیکھکر جس موضوع پر جو چیز چاہیے آسانی سے مل جاتی ہے، قاضی صاحب نے قرآن پاک کے بہت سے قلمی نسخے دکھائے، پہلی صدی ہجری میں جس قرآن کی مکمل کتابت ہوئی، اس کو بھی دکھایا، پھر اس جگہ لے گئے، جہاں سلاطین دہلی شاہان مغلیہ اور ان کے دور کے اور دوسرے خاندانی حکمرانوں کے عہد کے قلمی اور مصور نسخے تھے، ان کو باہر سے خوبصورت شیشے کی الماریوں میں دیکھا ایران، عراق، مصر اور ترکی کے حاصل کئے ہوئے مصور نسخوں کی بھی بڑی تعداد تھی، شاہنامہ اور نظامی کی مثنویوں کے مصور نسخے بہت نمایاں طور پر رکھے ہوئے تھے، میوزیم کے بند ہونے کا وقت قریب تھا، اس لئے ہر چیز عجلت میں دیکھی جارہی تھی، قاضی صاحب

نے ایک ایسا کمرہ بھی دکھایا جہاں منتشر اوراق اور پرزے دیکھے جو پڑھے جا سکتے ہیں، ان میں سے کوئی شخص ایک پرزہ بھی جیب میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کا عکس فوراً وہاں پڑ جاتا ہے، جہاں اس کمرہ کے نگراں بیٹھے رہتے ہیں، اس طرح یہاں سے کوئی چیز چوری نہیں ہوسکتی ہے، فراعنۂ مصر کے زمانہ کی بھی کچھ چیزیں دیکھیں، قاضی صاحب کہنے لگے کہ اس لائبریری میں جو کوئی بھی پڑھنے کے لئے سلپ کے ذریعہ سے کتابیں مانگتا ہے، وہ سلپ یہاں محفوظ ہو جاتی ہے، اس طرح ڈاکٹر اقبال نے جو کتابیں یہاں پڑھی تھیں، ان کے سلپ یہاں موجود ہیں، کتابیں کمپیوٹر کے ذریعہ سے معلوم کر لی جاتی ہیں کہ الماریوں میں اپنی جگہ پر ہیں کہ نہیں، میوزیم بند ہونے لگا، تو ہم باہر نکل آئے، اس کا افسوس رہا کہ جی بھر کر اس کو نہ دیکھ سکے۔

لوزاک اینڈ کو

مجھکو لوزاک اینڈ کو کی وہ کان دیکھنے کا اشتیاق تھا، یہاں سے دار المصنفین کے لئے بہت سی کتابیں منگوائی گئی ہیں، وہاں اسلامیات کی ایک فہرست ملی، جس میں کتابوں کے صرف نام دیکھ کر تعجب ہوا کہ اسلام پر اتنی کتابیں نکل چکی ہیں، اس میں زیادہ تر غیر مسلموں کی لکھی ہوئی کتابیں تقریباً سوا دو سو ہوں گی، جب غیر مسلموں نے اسلام پر کتابیں لکھ کر ڈھیر لگا دی ہیں تو ظاہر ہے کہ غیر مسلموں کے سامنے اسلام کا نقشہ ان ہی کے ذریعہ سے ہوگا، مگر یہ دیکھ کر خوشی بھی ہوئی کہ اس میں الغزالی اور ابن العربی، عطار اور طبری کے انگریزی ترجمے بھی تھے، مسلمان مصنفوں میں سے اے۔ انجم، امیر علی، ام۔ ام۔ علی، محمود ایوب، ان ملینائی۔ اس۔ اج۔ نصر، اے۔ رحمن، اف رحمن، ان صفوت، صالح مسلم، ای سعید ام۔ اے۔ سفیان۔ آئی شاہ، ام۔ ام۔ شریف۔ اے۔ آر۔ عطام، ال۔ باختر۔ اچ۔ درویش۔ اچ عنایت، اے۔ فیضی، جے حسین، اے حسین، اس عرفانی، اسلام، اس۔ ام۔ جعفری، ام۔ اے۔ قاسم۔ ام قادری ٹی۔ محمود، ڈاکٹر ٹی۔ یو۔ رحمن۔ ان۔ اے۔ صالح اور تنزیل الرحمن کے نام دیکھے۔

ای۔ جی۔ برل۔ لیڈن کی دوکان

اسلامیات کے یہ بھی مشہور تاجر اور ناشر ہیں، مشرق وسطی اور افریقہ پر

جتنی کتابیں انگریزی اور فرانسیسی نکلتی ہیں یا ان پر جتنے جرائد اور رسائل شائع ہوتے ہیں، ان کے پتہ تاجر ہیں، یہاں سے بھی فہرستیں لے کر محفوظ کرلیں، قاضی محمود الحق اور ڈاکٹر جاوید شمیم برابر ساتھ رہے، قاضی صاحب پھر اپنے دفتر لے چلے، وہاں ہم لوگ پہونچے تو کیمبرج کے وزیٹنگ پروفیسر ڈاکٹر معزالدین موجود تھے، ان کو ایک بار پھر دیکھ کر خوشی ہوئی، ان کے ساتھ ان کے ایک پاکستانی دوست تھے، جو امریکہ قائد اعظم چیئر کے پروفیسر ہو کر جارہے تھے، وہاں جناب سید شاہ معین الدین قادری بھی تھے، باتیں شروع ہوئیں تو قاضی صاحب اپنے یہاں کے معارف کے پرچے اور دار المصنفین کی مطبوعات نہ دکھلا سکے، ایک بار پھر اپنے یہاں مدعو کیا، مگر پھر جانے کا موقع نہ ملا، جس کا افسوس رہا، ڈاکٹر جاوید شمیم کے ساتھ واپسی ٹیوٹ ٹرین سے ہوئی، عزیزی ڈاکٹر فاتح ہارن چرچ کے اسٹیشن پر آگئے، وہ وہیں سے ال فورڈ کے ایک ہندوستانی ہوٹل میں لے گئے، ہم تینوں آدمی کے لئے چھ شامی کباب، دو قسم کے گوشت، دو تنوری روٹیاں، دو چپاتیاں، ایک پلیٹ سادہ چاول اور کچھ پاپڑ منگوائے، کھانے کے بعد بیس پونڈ کا بل ادا کیا، یعنی ۳۲۰ ہندوستانی روپے، یہ ہوٹل انگریز عورت مرد سے بھرا تھا، جو ہندوستانی کھانوں کے ساتھ بڑی مقدار میں شراب بھی پیئے جاتے تھے، کھانے پر عزیزی فاتح نے بتایا کہ وہ پیرس کے دو ٹکٹ لے آئے ہیں، صبح سویرے وہاں ہوائی جہاز سے جانا ہے، فرانسیسی سفارت خانہ سے ویزا تو نہیں مل سکا پیرس ہوائی اڈہ پر شاید مل جائے۔

پیرس کی سیر ساڑھے چھ بجے صبح کے ہوائی جہاز سے لندن سے پیرس روانہ ہوئے، ۴۵ منٹ میں وہاں پہونچ گئے، عزیزی فاتح برطانوی باشندے ہیں، ان کو تو ویزا کی ضرورت نہ تھی، مجھکو پھاٹک پر روک لیا گیا کہ میرے پاس ویزا نہ تھا، مگر ایک کونٹر کی خاتون نے میرے سن و سال کو دیکھ کر میری مدد کی، ان کی سفارش سے دو گھنٹے کے بعد پیرس کے اندر جانے کی اجازت ایک روز کے لئے مل گئی، ہوائی اڈے سے ایک ٹیکسی پر ہم لوگ اس بس سروس کے دفتر میں پہونچے جہاں سے سیاحوں کو پیرس کی سیر کرانے

کے لئے لے جایا جاتا ہے، وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ ایک بس تو ابھی جا چکی ہے، اب تین گھنٹے کے بعد دوسری بس جائے گی، ایک ٹکٹ ایک سو پچاس فرینک میں ملے گا، یہاں گیارہ فرینک ایک پونڈ کے برابر ہوتا ہے، اس طرح ایک ٹکٹ تقریباً ۱۴ پونڈ میں ملا، جو تقریباً دو سو چوبیس روپے ہندوستانی سکے کے برابر ہوئے، یہ گراں معلوم ہوا، ہم لوگوں کے پاس وقت بھی کم تھا، تھوڑے سے وقت میں ضروری چیزیں دیکھنی تھیں، اب تک صبح کا ناشتہ ہم لوگ نہ کر سکے تھے، ایک ریسٹوران میں جاکر سینڈوچ اور چائے مانگی گئی، سینڈوچ لندن کی طرح نہ تھی، مجھ سے کھایا نہیں گیا، ایک پیالی چائے پی لی اس کا بل آٹھ فرینک تھا، یعنی تقریباً تیرہ ساڑھے تیرہ روپے، لندن کے مقابلہ میں یہاں ہر چیز گراں پائی، ہم لوگوں کو مشکل یہ پیش آئی کہ ہم کسی سے انگریزی میں کچھ بولتے یا پوچھتے تو وہ اشارہ سے کہہ دیتے کہ وہ انگریزی نہیں سمجھتے، پولیس مین بھی یہ کہہ دیتے، کسی عمارت یا چیز کا نام پوچھتے تو وہ فرنچ لب و لہجہ میں فرنچ نام بتاتے تو بھی سمجھ میں نہیں آتا، دو گائیڈ بک خریدے تو ان ہی کے سہارے ضروری چیزیں دیکھیں، ایک ٹیکسی میں ہم لوگ نپولین کا مقبرہ دیکھنے چلے، راستہ میں کنکورڈ اسکوائر ملا، جس سے مجھکو خاص طور پر دلچسپی ہوئی، فرانسیسی انقلاب کے زمانے میں اس جگہ سے اہم خونریز واقعات وابستہ ہوئے، اسی مقام پر شہنشاہ لوئی شش دہم (۱۶) اس کی ملکہ میری انٹوئے نٹ، مادام رولان اور روبس پیر کو پھانسیاں دی گئی تھیں، ایک لمبے ستون کے آس پاس بہت سے مجسمے دکھائی دیئے جن کے فرانسیسی نام سمجھ میں نہیں آئے، نپولین کے مقبرے کے سامنے پہونچ کر اس کی شان و شوکت کا اثر پڑا، اس کی تاریخ یاد آگئی کہ اس نے پورے یورپ کو دہلا رکھا تھا، جس کو چاہتا شکست دیدیتا، اپنی مرضی کا حکمراں اور بادشاہ بناتا، اپنے لڑکے کو روم کا فرمانروا بنا دیا تھا، مگر آخر میں انگریزوں سے شکست کھا گیا، جنھوں نے اس کو بقیہ زندگی میں سینٹ ہیلینا میں محبوس رکھا، اس کی وفات ہوئی تو سات برس کے بعد فرانسیسی انگریزوں سے اجازت لے کر اس کی خاک کو پیرس لائے، اور اپنی عقیدت اور محبت کا خراج پیش کرنے کی خاطر اس کے لئے ایک

بڑا مقبرہ بنوایا، جس کے در و دیوار میں بڑی صلابت اور حشمت نظر آئی، یہ اس کے اوپر ایک بہت بڑا گنبد ہے، جو دور سے دکھائی دیتا ہے، یہ ۱۸۴۳ء کے بعد بنا، شاید اس کی تعمیر کے وقت خیال ہوا کہ یہ ایسا بنایا جائے جو فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہو، بڑے بڑے شاندار ستون اور مستحکم دیواریں نظر آئیں جن کو شان و شوکت کا ضرور اظہار ہوتا ہے، مگر آگرہ کا تاج محل اس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ شاندار، پرشکوہ اور دیدہ زیب ہے، دہلی میں ہمایوں کا مقبرہ، سکندرہ میں اکبر کی آخری آرامگاہ اور آگرہ میں اعتماد الدولہ کے مقبرے کے مقابلہ میں بھی میری نظر میں اس کی اہمیت زیادہ نہیں ہوئی اور ہم کو مغلوں کے دور کے فن تعمیر پر فخر محسوس ہوا، وہاں سے ہم لوگ ایفل ٹاور کی طرف چل پڑے، یہ ۱۸۸۹ء میں بنا جب کہ اس مقام پر ایک عالمگیر میلہ لگا تھا، ایفل اس انجینیر کا نام تھا جس نے اس کو بنایا، یہ پورا ٹاور لوہے کا بنا ہوا ہے، جس میں انجینیرنگ کا کمال دکھایا گیا ہے، یہ ۱۰۵۰ فٹ اونچا ہے، اس کی تین منزلیں ہیں پہلی منزل ۱۸۷، دوسری ۳۷۷ اور تیسری ۸۹۹ فٹ پر ہے، اس میں پندرہ ہزار لوہے کے ٹکڑے لگائے گئے ہیں، یہ اپنے فن کے لحاظ سے بڑی نادر چیز ہے، مگر جو ندرت دہلی کے قطب مینار میں ہے وہ اس میں کم از کم مجھکو تو نظر نہیں آئی، مگر فرانسیسیوں کو اس پر بڑا ناز ہے، اس کو اپنا قومی نشان سمجھتے ہیں جس میں ان کو اپنا مستقبل نظر آتا ہے، وہاں سے ہم لوگ نوتر دیم آئے جو فرانس کا سب سے بڑا گرجا ہے اس کی تعمیر کی ابتدا ۱۱۶۳ء میں ہوئی اور ۱۳۴۵ء میں مکمل کیا گیا، اس میں گوتھک آرٹ کے بہت اچھے نمونے ہیں، اس کے اندر نو ہزار آدمی جمع ہو کر عبادت کر سکتے ہیں، جگہ جگہ تعمیری آرٹ کے مظاہرے ہیں، ہم لوگ اندر گئے تو اس کے خدمت گذار بہت سی موم بتیاں جلانے میں مشغول تھے، باہر ایک میدان ہے جو اس عمارت کے لحاظ سے چھوٹا ہے، یہاں زائرین کی بھیڑ لگی رہتی ہے، فرانسیسی انقلاب کے زمانہ میں یہ عظیم الشان گرجا منہدم کیا جانے والا تھا، مگر پھر اس کو عقل کی دیوی کا گرجا قرار دیدیا گیا تو انہدام سے بچ گیا، اس عقل کی دیوی کا بڑا انقلابی پرستار ر دبس پیرے تھا، نپولین اعظم نے اپنے

زمانے میں اس کو پھر گرجا بنا دیا. اس سے تھوڑی دور پر ایک اور گرجا ہے جو La Conak - کہلاتا ہے، یہ دریائے سین پر واقع ہے، اور یہاں بھی مرکزی لندن کے Largeria دریائے ٹیمس کے پل کی طرح ایک پل بنا ہوا ہے، اور جس طرح لندن کے اس پل کی رونق انگلستان کی پارلیمنٹ کی انوکھی عمارتوں سے ہے، اسی طرح دریائے سین کے اس پل کی رونق اس گرجا سے ہے جو اپنے جائے وقوع کی وجہ سے نوتر دیم سے زیادہ بہتر نظر آیا، وہاں سے ہم لوگ سینٹ مائکل اسٹریٹ چلے آئے جس کے بازار میں دہلی کے چاندنی چوک کی طرح بھیڑ بھاڑ دکھائی دی، دوکانیں لندن کی دوکانوں ہی کی طرح سجی سجائی ہوئی تھیں، سڑکوں پر بڑے بڑے مکانات کثرت سے دیکھنے میں آئے، لندن کی بعض سڑکوں پر ایسے مکانات تو ہیں، مگر ان کی تعداد پیرس میں نسبتاً زیادہ ہوگی، یہاں کی سڑکوں کے دونوں طرف جتنے درخت دکھائی دیئے، وہ لندن میں نہیں ہیں، یہاں کی سڑکیں بھی لندن کی سڑکوں سے زیادہ کشادہ نظر آئیں، بعض فٹ پاتھ تو اتنے چوڑے تھے کہ ان پر موٹروں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں، یہاں سے ہم لوگ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر سانزا لیزے کی طرف چلے، بعض سڑکوں کے دونوں طرف ہرے بھرے درخت بہت خوبصورت معلوم ہوئے، اور بعض سڑکیں تو بہت ہی کشادہ اور دلکش نظر آئیں، ہاں لندن کی وضع کے رہائشی مکانات کم دکھائی دیئے، ٹیکسی ایک ایسے بلند گیٹ کے پاس رکی جو Arch of Triumph کے نام سے مشہور ہے، اس کو نپولین اعظم نے بنوانا شروع کیا تھا، جو ۱۸۳۶ء میں مکمل ہوئی، یہ ۱۶۴ فٹ بلند اور ۱۴۸ فٹ چوڑا ہے، نپولین اعظم نے اپنی شاندار فتوحات کی یادگار میں اس کو تعمیر کرایا، اس میں لڑائی کے مناظر بھی کھدے ہوئے نظر آئے، جا بجا ڈھال اور سپر بھی تھے، جن میں ان لڑائیوں کے نام کھدے ہوئے تھے، جو نپولین اعظم لڑتا رہا، اس کے اندر ایک چھوٹا سا میوزیم بھی تھا، جس میں ان فوجی سرداروں کے نام تھے جو اس کے ساتھ لڑے، اور ہلاک ہوئے، اسی کے سامنے پیرس کی مشہور سڑک سانزا لیزے

تھی، جو بہت چوڑی اور پُر رونق تھی، اس کے فٹ پاتھ اتنے کشادہ تھے، کہ ان پر کرسیاں اور میزیں لگی ہوئی تھیں، جن پر بیٹھ کر لوگ فکاہات اور مشروبات سے لطف اندوز ہو کر سڑک کے ہجوم کا تماشا بھی دیکھ رہے تھے، دونوں طرف درختوں کی قطاریں بھی لگی ہوئی تھیں، سجی سجائی دوکانیں بکثرت تھیں، گوتھک آرٹ کے اونچے اونچے مستحکم مکانات سے اس کی شوکت میں اضافہ ہو رہا تھا، یہ جگہ سیاحوں کی بہشت سمجھی جاتی ہے، یہیں پورا فرانس دیکھا جا سکتا ہے، معلوم نہیں میری نظروں کو دھوکہ ہوا کہ یہاں کے مرد عورت لندن کے مقابلہ میں چھوٹے قد کے معلوم ہوئے، لندن میں قد بالا کی جو رعنائی نظر آئی، یہاں دکھائی نہیں دی، دونوں کے لباس اور وضع قطع میں کوئی زیادہ فرق نہیں معلوم ہوا، فحاشی کے بعض مناظر کو دیکھ کر ندامت سے یہاں بھی آنکھیں جھکانی پڑیں، ریسٹوران میں یہاں بھی شراب کی ریل پیل تھی، ہمارے پاس وقت بہت کم تھا، ہم کو ساڑھے سات بجے شام کو لندن جانے کے لئے ہوائی اڈہ پہونچنا تھا، پیرس گرجا گھروں، محلوں، ہوٹلوں اور تفریح گاہوں کا شہر ہے، ان سب کو دور سے دیکھا، خواہش تھی کہ یہاں آکر دنیائے اسلام کے مشہور محقق اور عالم ڈاکٹر حمید اللہ کی بھی زیارت کروں، لندن سے ان کو ایک عریضہ بھیجا تھا کہ پیرس آکر ان کی دست بوسی کے لئے حاضر ہوں گا، مگر ان کا خط موصول ہوا کہ میرا ان کے پاس پہونچنا مشکل ہے، اس لئے کہ ان کے یہاں ٹیلیفون نہیں، اور وہ جس مکان میں رہتے ہیں، وہاں تک پہونچنے کے لئے ایک سو بیس زینے چڑھنے ہوتے ہیں، اس لئے انھوں نے لکھا کہ میں جہاں قیام کروں وہاں وہ خود آجائیں گے، چند گھنٹے کے قیام میں کہیں ٹھہرنے کا سوال نہیں تھا، ٹیلیفون سے بھی رابطہ ممکن نہ تھا، کچھ لوگوں کو ان کا پتہ دکھایا، وہ بتا نہ سکے، اور کچھ بولے بھی تو ہم سمجھ نہ سکے، مایوس ہو کر ہم ہوائی اڈے چلے آئے، ان سے نیاز حاصل نہ کرنے کا افسوس زندگی بھر رہے گا، ہوائی اڈے پر معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز کسی خاص وجہ سے دیر کر کے لندن جائے گا، پیرس آتے ہوئے لندن کے ہوائی اڈے کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع

ملا تھا، اس کا موازنہ پیرس کے ہوائی اڈے سے کیا تو لندن کا ہوائی اڈہ مجھ کو زیادہ بہتر اور خوبصورت نظر آیا، مگر دونوں ہوائی اڈوں میں داخل ہوتے ہی معلوم ہوا کہ ہم کسی شاندار محل میں آگئے، سلائیڈ کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، گیلری، راستے، اور زینے متحرک ہو جاتے ہیں، کمپیوٹر، الیکٹرونک مشین اور وائرلیس سے کام اس طرح کرتے دیکھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ سارے کام خود بخود انجام پا رہے ہیں، دونوں ہوائی اڈوں پر جگمگاتی دوکانوں بھی دیکھیں، لندن دو بجے رات کو واپس آئے، چند گھنٹے میں پیرس کو کیا دیکھتا، بستر پر لیٹا تو ایسا معلوم ہوا کہ پیرس گیا نہیں تھا، بلکہ نیند میں کوئی خواب دیکھا تھا، صبح کو اٹھا تو تھکا تھکا معلوم ہوا، اس لئے دو روز تک گھر ہی پر آرام کرتا رہا۔

ٹریڈ یونین کانگریس کے جلسے

ایک روز عزیزی فاتح نے ٹی۔ وی۔ کھولا تو اس میں انگلستان کے ٹریڈ یونین کانگریس کے جلسے کی کارروائی دکھائی جا رہی تھی، حکومت کی طرف سے Denation alsational Palratisation کی اسکیم آنے والی ہے، اسی کے خلاف احتجاجی جلسہ تھا، ان مسائل سے تو مجھ کو دلچسپی نہیں ہوئی، لیکن یہ دیکھنے کا شوق ہوا کہ اس کے جلسے کیسے ہوتے ہیں، ایک بڑا ہال تھا جو بالکل عورتوں اور مردوں سے بھرا ہوا تھا۔ حاضرین خاموشی اور سنجیدگی سے بیٹھے تھے، مائک پر آکر مقررین تقریر کرتے، جتنے مقررین آئے، اپنی لکھی ہوئی تقریریں پڑھتے، زبانی تقریر کسی نے نہیں کی، تقریر کرتے وقت وہ اپنے مسائل کو واضح کرنے کی خاطر اعداد و شمار اور واقعات پیش کرتے، میں جب تک لندن میں رہا، عام انگریزوں کو بولتے سنتا، تو ان کا لب و لہجہ کچھ ایسا ہوتا کہ انگریزی جاننے کے باوجود ان کی گفتگو سمجھ میں نہیں آتی، معلوم ہوا کہ وہ کوکنی لب و لہجہ میں برتتے ہیں، اسلئے بیرونی لوگوں کو سمجھنے میں دقت ہوتی ہے، مگر ٹریڈ یونین کے لیڈروں کی تقریریں سنیں تو ان کا ایک ایک لفظ سمجھ میں آیا، یا جو خبریں براڈ کاسٹ ہوتیں، وہ بھی اچھی طرح سمجھ میں آجاتیں، خبروں کے براڈ کاسٹ

کرنے میں آکسفورڈ ایکسنٹ کا پورا خیال کیا جاتا، پڑھے لکھے لوگ آکسفورڈ ایکسنٹ ہی میں گفتگو کرتے ہیں، جن کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ ذہن میں یہ بات تھی کہ ٹریڈ یونین کانگریس کے جلسے بڑے ہنگامہ خیز ہوا کرتے ہوں گے، مگر جو کارروائیاں دیکھیں، ان میں شروع سے آخر تک سنجیدگی رہی، یہاں ڈسپلن ہر شعبۂ زندگی میں نظر آیا، یہی ڈسپلن اس کے جلسوں میں دکھائی دیا، مسز وزیر اعظم اور مسز مارگریٹ تھیچر پر سخت نکتہ چینیاں ہوئیں، لیکن ان کا انداز سنجیدہ تھا۔

تیمس دریا کی پھر سیر

عزیزی فاتح ۲۸ ستمبر کو ایک بار پھر مرکزی لندن لے گئے، دریائے تیمس، پارلیمنٹ، بکنگھم پیلس، اور ہائڈ پارک کی ایک بار پھر سیر کی، ہائڈ پارک میں پھر وہی ساری چیزیں دیکھیں جن سے آنکھیں ندامت سے جھک گئیں۔

سوشل ڈیموکریٹ پارٹی کے جلسے

انگلستان کی مشہور لیبر پارٹی سے کچھ لوگوں نے علیحدگی اختیار کر کے سوشل ڈیموکریٹ پارٹی بنالی ہے، گذشتہ الیکشن میں پارلیمنٹ میں ان کے پانچ ممبر منتخب ہوئے، جن میں ایک لارڈ بھی ہے، اس کے اجلاس کی بھی کارروائیاں ٹی۔ وی پر دیکھتا رہا، پارلیمنٹ کے یہ ممبر اسٹیج پر بیٹھے دکھائی دیئے، اور ان سے مواخذہ کیا جا رہا تھا کہ انھوں نے اپنے اپنے حلقوں کے لئے اب تک کیا کیا، ہر ممبر جواب دینے میں بڑی ذمہ داری محسوس کرتا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اگر اس نے کسی قسم کی کوتاہی کی، تو وہ مجرم ہے، اس احساس کی قدر ہوئی، پھر ہر حلقہ کے لوگ باری باری اسٹیج پر آکر تقریریں کرتے، ان کی بھی تقریریں لکھی ہوئی ہوتیں، جس سے معلوم ہوا کہ یہاں اہم جلسوں میں لکھی ہوئی تقریریں کرنے کا عام رواج ہے، ان کی تقریریں جذباتی یا چیخنے چلانے والی نہ تھیں، ٹھوس واقعات سے پر تھیں، معاشیات، سیاسیات اور عمرانیات کی اصطلاحات ان کے نوک زبان تھیں، جن سے معلوم ہوا کہ ان کی معلومات کتنی وسیع تھیں، ان کی تقریریں بھی آکسفورڈ ایکسنٹ میں تھیں، جن کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی، بعض تقریروں سے تو زبان کا لطف آتا ہے،

اس پارٹی میں ہندوستان اور پاکستان کے لوگ بھی شامل ہیں، ان کی تقریریں بھی سننے میں آئیں، وہ بے تکلف انگریزی بولتے رہے، مسز تھیچر پر خوب خوب حملے کئے گئے، ایشیائی مقررین زیادہ تر Immigration میں آسانی کے خواہاں تھے، ان کی تائید حاضرین بھی کر رہے تھے۔

کالوں کی سرگرمیاں

اتنا تو معلوم ہوا کہ پورے انگلستان میں مسلمان پچیس لاکھ ہیں، لندن میں ان کی تعداد پانچ لاکھ ہے واللہ اعلم، ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد تو اور بھی زیادہ ہوگی، ان سب کی چھوٹی بڑی دوکانیں بھی دیکھیں، یوگنڈا سے جو ہندوستانی یہاں آئے، وہ بڑی دولت ساتھ لائے، اور یہاں بڑی بڑی دوکانیں خرید لیں، بعض حلقوں میں مسلمانوں کا بھی اچھا کاروبار ہے، مگر ہندوستان و پاکستان کے لوگ یہاں کی معاشرتی اور تفریحی سرگرمیوں میں نظر نہیں آتے۔ البتہ کالے مرد اور عورتوں کو گورے مرد اور عورتوں کے ساتھ متحرک پایا، معلوم ہوا کہ یہ زیادہ تر ظیپاین اور نیوزیلینڈ یا کچھ افریقہ کے ہیں، ان کے گانے اور رقص یہاں بہت پسند کئے جاتے ہیں، ان کو سننے اور دیکھنے کے لئے انگریزوں کا بڑا ہجوم ہوتا ہے، یہ کالے کھیل کے میدان میں بھی نمایاں ہوتے ہیں، کرکٹ کے ٹسٹ میچ میں بھی ان کی شرکت ہوجاتی ہے، ان کے بچے بہت ذہین ہوتے ہیں، اسکول کے بچوں کی ذہانت کا جہاں پروگرام ہوتا ہے، وہاں کوئی نہ کوئی کالا بچہ ضرور ہوتا ہے، وہ زیادہ تر عیسائی ہیں، یہاں کا پورا تمدن اختیار کر لیا ہے، ان کی عورتیں بھی یہاں کی عورتوں کی طرح نیم عریاں لباس اور جانگیہ پہنے ہوئے دکھائی دیں، ہندوستان اور پاکستان کی عورتیں، اپنے ہی لباس یعنی ساڑی، شلوار، کرتہ اور دوپٹہ میں نظر آئیں، مگر یہ بھی سننے میں آیا کہ ایک ہندوستانی مسلمان لڑکی نے ایک انگریز سے شادی کر لی، اور یہ گرجا گھر میں ہوئی، یہاں کے تمدن میں جو کچھ ہوجائے، اس پر تعجب کرنا بے محل ہے، جو کچھ نہ ہو، اس پر شکر کر کے اکتفا کر لیا جائے، مگر زیادہ تر ہندوستانی اور پاکستانی خاندان ایسے ہیں، جو اپنے ذہن کو بیدار رکھ کر اپنی تہذیب اور مذہبی عقائد کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، آل فورڈ کی ایک مسجد میں کئی جمعہ کی نماز پڑھنے کا

اتفاق ہوا، یہ بھری رہتی تھی، بچے بھی نماز میں شریک رہتے تھے، یہاں نماز کے بعد سلام بھی مل کر پڑھا کرتے تھے،

اخبارات ورسائل | یہاں کے اخبارات کی ضخامت اچھی خاصی ہوتی ہے، ٹائمس کا روزانہ اڈیشن ۳۲ صفحے کا ہوتا ہے، اور اس کا سنڈے اڈیشن ۸۰ صفحے کا دیکھا، دہلی ٹیلیگراف کا روزانہ اڈیشن ۲۰ صفحے اور اس کا سنڈے اڈیشن ۳۶ صفحے کا شائع ہوتا ہے، یہی حال گارجین اور آبزرور وغیرہ کا ہوتا ہے، مگر ان میں اشتہارات بکثرت ہوتے ہیں، ایک بار ٹائمس کے سنڈے اڈیشن کا جائزہ لیا، تو اس میں تقریباً ۶۰ صفحے اشتہارات تھے، بقیہ ۲۰ صفحے میں خبریں اور متفرق مضامین تھے، مگر یہاں کے اخبارات، اور بی۔ بی۔ سی بڑی طاقت رکھتے ہیں، جس طرح چاہیں رائے عامہ کا رخ موڑ دیتے ہیں، اردو اخباروں میں یہاں سے کراچی کے اخبار جنگ کا لندن اڈیشن شائع ہوتا ہے، نوائے وقت اور جسارت بھی لوگوں کے ہاتھوں میں دیکھا، جو ہوائی جہاز سے روزانہ آتے ہیں تقریباً ہر کونٹی سے یہاں ایک ہفتہ وار یا پندرہ روزہ اخبار ضرور نکلتا ہے، اور اس کی بھی اشاعت خوب ہوتی ہے، مثلاً دی روم فورڈ انڈی پنڈنٹ پر نظر پڑی تو اس پر لکھا ہوا تھا کہ اس کی اشاعت تہتر[۷۳] ہزار چار سو پچاس ہے، یہ ۳۲ صفحے کا ہفتہ وار تھا، مگر اس میں تقریباً ۲۰ صفحے اشتہارات سے بھرے تھے، چار صفحے میں کونٹی کی خبریں تھیں، اور ایک آدھ مضمون بھی تھا جس میں شادی کے موقع پر توہمات کا ذکر تھا، مثلاً دلہن کو اپنی شادی کا کیک خود سے نہیں کاٹنا چاہئے، بلکہ دولہا کے ساتھ مل کر اس کا پہلا ٹکڑا کاٹنے، ورنہ اس کو اولاد نہ ہوگی، دلہن کے ساتھ جو برائڈ میڈ ہو، وہ کیک کے ٹکڑے کو اپنی جیب میں برابر رکھے رہے، تو اس کی شادی جلد ہوجائے گی، اگر خاندان میں کوئی نئی شادی ہو تو پھر شادی کا کیک اس وقت تک محفوظ رکھا جائے جب تک کہ خاندان کی تمام لڑکیوں کی شادی نہ ہوجائے، ورنہ وہ پریشانی میں مبتلا رہے گی، اسکاٹ لینڈ میں شادی کے بعد گھر میں

جوڑا داخل ہوتا ہے، تو اس وقت ایک مرغی اس خیال سے اڑائی جاتی ہے کہ دلہن مرغی کی طرح بچے والی ہو،

یہاں کے ہفتہ وار اخبار میں کسی کے متعلق کوئی خراب خبر شائع ہوجاتی ہے، تو وہ اس کو اپنے لئے بڑی سزا سمجھتا ہے، ڈاکٹر تو ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں اس کے متعلق ایسی خبر شائع نہ ہوجائے جس سے اس کی بدنامی ہو، رسالے تو بے شمار نکلتے ہیں، عزیزی فاتح کی سرجری میں آنے والے مریضوں کے لئے یہ رسالے دیکھے، ویمنز ریلم، کیمرا ویکلی، ویمنز ویکلی، مائی ویکلی، فیملی سرکل، سنڈے ایکسپرس، ریڈر ڈائجسٹ وغیرہ، ان میں زیادہ تر اشتہارات تھے، یا عورتوں کی حیا سوز تصویریں، مضامین کم تھے، مگر ان کی اشاعت کافی ہوتی ہے، ریڈر ڈائجسٹ کے سرورق پر لکھا ہوا دیکھا کہ اس کی اشاعت ۳۴ ملین ہے، اور یہ سولہ[۱۶] زبانوں میں شائع ہوتا ہے، اس کے ۱۰۴ صفحے میں ۶۵ صفحے اشتہارات تھے، یہاں کے اخبارات اور رسائل اشتہارات ہی کی آمدنی سے چلتے ہیں، مگر پڑھنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں، بعض دکانیں تو صرف اخبارات ہی کی تھیں، ایک بوڑھی خاتون کو فٹ پاتھ پر ایک چھوٹی گاڑی پر رکھ کر اخبار فروخت کرتے دیکھا، ہر دو یا تین منٹ پر کوئی خریدار ضرور آجاتا،

بی۔ بی۔ سی | ۲۱ ستمبر کو بی۔ بی۔ سی۔ میں مدعو تھا، گذشتہ بیس[۲۰] برس سے بی۔ بی۔ سی کی اردو سروس کو برابر سنتا رہتا ہوں، لندن آیا تو اس کے اسٹیشن کو اندر سے دیکھنے کا اشتیاق تھا، اتفاق سے اس کے اردو سروس کے انچارج ڈیوڈ ڈھوپ سے رابطہ پیدا ہوگیا، انھوں نے ۱۶ ستمبر کو اپنے یہاں بلایا، پھر ان کو معلوم ہوا کہ انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم اور جواہر لال یونیورسٹی کے اردو کے استاد جناب صدیق الرحمن قدوائی بھی آئے ہوئے ہیں تو مجھ کو ٹیلیفون کیا کہ ۱۶ ستمبر کے بجائے ۲۱ ستمبر کو آئیں تو ان لوگوں سے بھی ملاقات ہوجائے گی، اور ایک اچھا پروگرام بن جائے گا، ڈاکٹر خلیق انجم نے دہلی میں اردو گھر کی تعمیر کر کے جو کارنامہ انجام دیا ہے، اس سے متاثر ہوں، اس لئے میں نے جواب دیا کہ ان لوگوں کے ساتھ

پروگرام کی شرکت سے خوشی ہوگی، عزیزی فاتح مشغول تھے، اس لئے اور جگھوں کی طرح بی۔ بی۔ سی نہ پہنچا کر بارن چرچ کے اسٹیشن پر بیٹھ گیا، اور ٹمپس اسٹیشن میں اتر گیا، جیسے ہی اترا، ایک خاتون میری ہندوستانی وضع قطع دیکھ کر میرے پاس آئیں اور بولیں بی۔ بی۔ سی کی طرف سے آپ کا خیر مقدم کرنے آئی ہوں، عزیزی فاتح نے ڈیوڈھوپ کو میرے روانہ ہونے کی اطلاع دیدی تھی، خاتون نے چائے پینے کی دعوت دی، مگر میں نے شکریہ ادا کرکے جلد بی۔ بی۔ سی۔ پہونچانے کو کہا، پانچ منٹ کا راستہ تھا، مگر انھوں نے اس تھوڑی سی مدت میں اپنے اعلیٰ اخلاق کا پورا ثبوت دیا، وہاں پہونچا تو ڈیوڈھوپ، خلیق انجم اور قدوائی صاحبان کے ساتھ انتظار کر رہے تھے، ڈیوڈھوپ نے فوراً اپنے فوٹوگرافر کو بلایا، اور دفتری کارروائی کی، پھر علی رضا عابدی صاحب نے اپنا تعارف کرایا، ان سے مل کر خوشی ہوئی، کیونکہ انھوں نے دار المصنفین کے کتب خانہ پر کچھ فیچر براڈ کاسٹ کیا تھا، ان کے والدین لکھنؤ کے رہنے والے تھے، مگر اپنی ملازمت کے سلسلہ میں کراچی میں آباد ہو گئے تھے، اب عابدی صاحب پاکستان کے شہری ہیں، یہیں سارہ نقوی صاحبہ سے ملاقات ہوئی، ان کا خاندان علی گڑھ کا تھا، مگر انھوں نے تعلیم حیدر آباد میں پائی، اب پاکستانی ہیں، بی بی سی میں سائنس مجلس کا پروگرام وہی براڈ کاسٹ کرتی ہیں، وسیم صدیقی صاحب لکھنؤ کے رہنے والے تھے، اب پاکستانی ہیں، اسپورٹس کے پروگرام کی انچارج ہیں، آصف جیلانی صاحب علی گڑھ کے رہنے والے تھے، تعلیم جامعہ ملیہ میں پائی، اب پاکستانی ہیں، سیربین میں ان کا بھی پروگرام ہوتا ہے، پہلے جنگ کراچی میں کام کرتے تھے، اطہر علی صاحب ان دنوں علیل تھے، دفتر نہیں آتے تھے، وقار احمد صاحب رات کو آیا کرتے ہیں، ان سے ملاقات نہیں ہوسکی، ان کا بھی آبائی وطن یوپی ہی تھا، ان سے نہ ملنے کا افسوس رہا، ہم تینوں آدمیوں کا انٹرویو رضا علی عابدی صاحب نے لیا، تقریباً بیس منٹ تک یہ جاری رہا، انٹرویو کے درمیان ڈیوڈھوپ ریکارڈ کرنے میں متحرک رہے، سوالات زیادہ تر ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون اور اردو سے متعلق تھے، اس کے بعد ڈیوڈھوپ نے لنچ کے لئے اصرار کیا، لنچ کا وقت بھی تھا، ہم لوگ ایک ہال میں گئے، تو سیکڑوں آدمی وہاں لنچ کھا رہے تھے، معلوم ہوا کہ تقریباً ۲۱ ہزار آدمی

پورے بی۔ بی۔ سی کے اسٹاف میں ہیں، اور ۳۵ زبانوں میں پروگرام براڈ کاسٹ ہوتے ہیں، کام کرنے کے طریقہ کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی، سارہ نقوی صاحبہ سے باتیں کر رہا تھا کہ یکایک انھوں نے ایک کمپیوٹر پر اپنی انگلیوں کو حرکت دی، تو دوسری مشین میں ایک ٹائپ کاغذ نمودار ہوگیا، معلوم ہوا کہ سائنس سے متعلق آج کی یہ معلومات ہیں، جو انھیں مرتب کرکے براڈ کاسٹ کرنا ہے، سارا کام کمپیوٹر ہی سے انجام پاتا ہے، جس کو دیکھکر مجھ کو تو ہر لمحہ تعجب ہو رہا تھا، شاہین کلب کے پروگرام میں سدھو بھائی کا رول بہت ہی دلچسپ اور عجیب وغریب ہوتا ہے، ان کو دیکھنے کا اشتیاق تھا، وہ باہر گئے ہوئے تھے، آئے تو بہت اخلاق سے ملے، ان کا اصلی نام محمد علی شاہ ہے، راجستھان کے رہنے والے ہیں، اردو بہت اچھی بولتے ہیں، مگر ریڈیو میں جو آواز سنی تھی، وہ مختلف تھی، کہنے لگے کہ وہ آواز تو بناوٹی ہوتی ہے، اپنے پاس دیر تک بٹھائے رکھا، پھر اسٹیشن تک پہونچا بھی دیا، ڈیوڈھوپ نے چلتے وقت ایک بند لفافہ بھی دیا، جس کو میں لینا پسند نہیں کرتا تھا، کہنے لگے کہ اس کے بغیر انٹرویو براڈ کاسٹ قانوناً نہیں ہوسکتا ہے، خلیق انجم صاحب تو پہلے رخصت ہو چکے تھے، میں تقریباً وہاں چار گھنٹے رہ کر اسٹاف کی خوش خلقی کی یادوں کی برات لیکر قیامگاہ پر پہونچا،

لندن کی بقرعید ۱۸ ستمبر کو عید الاضحیٰ تھی، عزیزی فاتح نے ریجنٹ پارک کی بڑی مسجد میں اس کی نماز ادا کرنے کو کہا، عزیزی ڈاکٹر جاوید شمیم بھی قیامگاہ پر پہونچ گئے، عزیزی فاتح کی بیگم بھی ساتھ چلیں کیونکہ وہاں عورتوں کی نماز ہوتی ہے، ان کا لڑکا عزیزی محمد علی بھی ساتھ ہوا، یہ مسجد ۲۰ میل کے فاصلہ پر تھی، وہاں ساڑھے سات بجے سے ہر گھنٹہ پر ایک جماعت کھڑی کی جانے والی تھی، ہم لوگ لندن کی سڑکوں کی بھیڑ بھاڑ کو طے کرتے ہوئے ساڑھے گیارہ بجے سے پہلے وہاں پہونچے، بڑا ہجوم تھا، میلہ لگا ہوا تھا، ٹوپیوں اور دوسری دوسری ضروری چیزوں کے چھوٹے چھوٹے اسٹال لگے ہوئے تھے، موٹر کا پارک کرنا آسان نہ تھا، دور جاکر کسی طرح کھڑی کی گئی، ہم لوگ ہجوم سے ہوتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے کہ ساڑھے گیارہ والی آخری جماعت کھڑی ہوگئی، مسجد سے باہر صحن میں جگہ ملی، نماز میں تکبیریں ہم لوگوں کے مسلک کے مطابق نہیں کی گئیں، پہلی رکعت میں تحریمہ

باندھتے ہی سات تکبیریں کہی گئیں، شاید امام صاحب نے ثنا نہیں پڑھی اور تکبیریں شروع کر دیں، دوسری رکعت میں سجدہ سے کھڑے ہوتے ہی پانچ تکبیریں کہیں، دونوں رکعتوں میں سورہ اعلیٰ اور سورہ غاشیہ پڑھیں، نماز کے بعد خطبہ شروع ہوا تھا، تو ہندوستان ہی کی طرح لوگ اٹھنے لگے، جس سے سنائی کم دینے لگا، مقتدیوں میں ہر قسم کے لوگ نظر آئے، عرب، نائجیریا، شام، مصر، پاکستان اور ہندوستان سب ہی کی نمائندگی تھی، زیادہ تر لوگ سوٹ ہی میں تھے، مگر نائجیریا اور سعودی عرب کے روایتی لباس بھی دیکھنے میں آئے، کچھ شروانیاں بھی دیکھی گئیں. شلوار اور کرتے بھی۔ پانچ جماعتیں ہوئیں، تو لوگوں کا بیان تھا کہ پچیس ہزار آدمیوں سے کم نہیں رہے ہوں گے، کچھ لوگوں کو نماز نہیں ملی، تو بارہ بجے پھر ایک جماعت کھڑی کی گئی، مجھکو اس مسجد میں اعظم گڈھ کی عیدگاہ سے زیادہ لطف آیا، خلاف توقع یو۔ پی۔ بہار، اور پاکستان کے بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں، ام۔ اے۔ فاروقی اڈیٹر امپیکٹ، رشید احمد صدیقی (ڈائرکٹر یو کے مشن) عبدالرحمٰن برکی مع اپنے صاحبزادگان، حمید اللہ صاحب کے علاوہ، آصف جیلانی (بی۔ بی۔ سی) ڈاکٹر مختار احمد (بہار)، ڈاکٹر علی حسین (بہار) عزیزی سراج گیلانی مع اپنی پوری فیملی کے، بہار کے سابق وزیر تعلیم سر فخر الدین کے خاندان کے اعزہ ام۔ اے۔ علوی (کراچی)، عبدالعلی خاں (یو۔ پی)، رئیس امام (بہار) وغیرہ سب ہی گرم جوشی سے ملے، اور اسلامی اخوت کے ناطے اور بھی لوگ ملتے رہے، جن کے نام معلوم نہ ہو سکے، دو گھنٹے ملنے ملانے میں لگ گئے، اس ہجوم کو دیکھکر خوشی ہوئی، معلوم ہوا کہ لندن میں عیسائیوں اور یہودیوں کے کسی تہوار کے موقع پر اتنا بڑا ہجوم نہیں ہوتا ہے، دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ اسلام کی شمع ہر جگہ فروزاں رکھے آمین

اس ہجوم میں جا بجا پمفلٹ بھی تقسیم کئے جا رہے تھے، جن میں مجھکو دو ملے، ایک کا عنوان "ہماری عید اور عراق کے مجرمین" تھا، یہ لیورپول کے عراقی طلبہ کی اسلامک یونین کی طرف سے تھا، اس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ صدام نے عراق میں کافرانہ نظام قائم کر رکھا ہے، اس نے ہزاروں مسلمانوں

کو جیلوں میں بند کر رکھا ہے، کردوں کو شمالی عراق سے جلا وطن کر کے جنوبی عراق کے تکلیف دہ علاقے میں بھیج دیا ہے، بڑے بڑے علماء مثلاً آیت اللہ محمد باقر الصدر، شیخ عبد العزیز البدری، شیخ عارف البصری وغیرہ کو شہید کر دیا ہے، ہم صدام کے خلاف جہاد کر کے وہاں اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔

یہ اشتہار ان طلبہ کی طرف سے تھا، جو ایرانی انقلاب کے طرفدار ہیں، اور شاید ان کے حامیوں کے اشارہ پر یہ لکھ کر شائع کیا گیا۔

دوسرا پرچہ افغانستان کے مجاہدین کی طرف سے تھا، جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ کس طرح گذشتہ پانچ برس سے اس جہاد میں مصروف ہیں، اب تک افغانستان کی موجودہ حکومت کی طرف سے ہزاروں آدمی ہلاک کئے جا چکے ہیں، پھر بھی ننانوے فی صدی آدمی موجودہ حکومت اور روسیوں کے خلاف ہیں، مجاہدین کی تعداد شروع میں کم تھی، لیکن اب وہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں، وہ تو اب کابل پر برابر حملے کر رہے ہیں، روسی چاہتے ہیں کہ صلح ہو جائے، وہ افغانستان کے سابق حکمراں ظاہر شاہ کو واپس لانا چاہتے ہیں، لیکن مجاہدین ان کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کیونکہ وہ ایک کمزور قسم کے حکمراں ہونے کا ثبوت دے چکے ہیں، اور اگر آ گئے، تو روسیوں کے حامی ہوں گے، ان ہی کے زمانے میں افغانستان کا دروازہ روسیوں کے لئے کھل چکا تھا، اس پرچہ میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ باعلان، بامیان، غزنی، غور، ہرات، کندوز، ننگرہار وغیرہ ان کے تسلط میں ہیں وغیرہ وغیرہ

ساودتھ ہال عزیزی فاتح نے یہ تہوار منانے کے لئے ساودتھ ہال کی طرف اپنی موٹر موڑ دی، جہاں پہنچکر ایسا معلوم ہوا کہ ہم ہندوستان کے کسی شہر میں پہونچ گئے، یہ سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کا علاقہ ہے، سرداروں کی پگڑی داڑھی، ہندوؤں کی دھوتی، اور مسلمانوں کے پائجامے نظر آئے، بقرعید کے دن مسلمان بچوں نے جو نئے نئے لباس پہنے تھے، وہ بھی دیکھنے میں آئے، عزیزی فاتح ایک مسلمان

کے ہوٹل میں لے گئے، جہاں ہم پانچ آدمیوں نے تنوری نان، چپاتیاں، بریانی، تکے کباب، سیخ کباب، بکرے اور مرغ کے قورمے کھائے، تمام چیزیں خالص ہندوستانی مذاق کی تھیں، اور کھانے میں لذیذ معلوم ہوئیں، آخر میں بارہ ۱۲ پونڈ کا بل ادا کیا گیا، جو لندن کے اور ہوٹلوں کے مقابلہ میں سستا نظر آیا، وہاں سے نکل کر ہم لوگ ایک سردار جی کی ایک دوکان میں گئے، جو کتابیں اور رسائل فروخت کرتے ہیں، وہاں اردو کی کتابیں بھی تھیں، ان میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی دو کتابوں "انیس شناسی" اور "سفر آشنا" پر بھی نظر پڑی، موخر الذکر ان کا یورپ کا سفرنامہ ہے، ہندو شاعروں میں سے طالب چکوالی اور بادا کرشن گوپال کے کلام کے مجموعے بھی رکھے دیکھے، اردو ناول تو بہت تھے، جن میں دہلی کے اسٹار پبلیکیشنز کے سلسلہ کے ناول بہت بڑی تعداد میں تھے، خیال ہوا کہ یہ ناول معیاری نہ ہوں، مگر ان کے ذریعہ سے اردو کی ترویج تو ہو رہی ہے، لاہور کے محمد شریف بقا کا ایک رسالہ برطانیہ میں اردو شاعری بھی دیکھا، اور ان کے اس کام کو دیکھکر خوشی ہوئی کہ بچوں کے لئے عام فہم انگریزی میں چھوٹے چھوٹے رسالے پرافٹ محمد اور وھاٹ از اسلام بھی وہاں رکھے دیکھے، اردو انگریزی ڈکشنری کے علاوہ اور Urdu Made easy کا ایک رسالہ بھی وہاں تھا.

ڈاکٹر کلیم صدیقی سے الوداعی ملاقات

۱۲ ستمبر کو اعظم گڈھ کی واپسی تھی، خیال ہوا کہ مسلم انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر کلیم صدیقی سے آخری بار مل لوں، ان ہی کی دعوت پر لندن کا سفر تھا، آخری بار ان کا شکریہ بھی ادا کرنا تھا، میری قیامگاہ سے وہ تقریباً ۵۵ میل پر سلاؤ میں رہتے ہیں، عزیزی ڈاکٹر جاوید شمیم وہاں کی رہنمائی کرنے کے لئے تیار ہوئے، ٹیوب ٹرین سے تو کئی بار سفر کر چکا تھا، وہاں سرفیس ٹرین سے بھی کچھ دور جانا پڑا، اس ٹرین کے ٹکٹ کے لئے کھڑکی پر پہونچا تو سلاؤ کا نام لیتے ہی بکنگ کلرک نے اپنی مشین کا بٹن دبایا تو ایک شیشے پر کرایہ کی رقم لکھی ہوئی تھی، وہ فوراً ادا کی گئی، تو ٹکٹ بھی چند لمحے میں مل گیا، ہم لوگ ٹرین کے ڈبے میں بیٹھے تو ایسا معلوم ہوا کہ کسی ڈرائنگ

روم میں آکر بیٹھ گئے ہیں، بہت صاف ستھرا، اور بیٹھنے کے کوچے انتہائی آرام دہ تھے، بڑی تیز رفتار تھی، سلاؤ اسٹیشن پہونچے، تو ڈاکٹر کلیم الدین صاحب اپنی موٹر لے کر پیشوائی کے لئے موجود تھے، اپنے گھر لے گئے، بہت پر تکلف اور خوش ذائقہ کھانا کھلایا، جو ان کی بیگم صاحبہ نے لکھنؤ کے مذاق کا پکایا تھا، لطف و لذت کے ساتھ کھایا، پھر ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کے اس صدارتی خطبہ پر باتیں شروع ہوئیں، جو انھوں نے سمینار میں دیا تھا، میں نے ان سے عرض کیا کہ معارف میں اس پر میرے تاثرات شائع ہوں گے، مجھکو جہاں جہاں اس سے اختلافات تھے، اس پر بھی گفتگو کرتے ہوئے ان سے کہا، میرا اختلاف جس مخلصانہ جذبہ میں لکھا گیا ہے، اسی جذبہ کے ساتھ آپ معارف میں پڑھیں، انھوں نے بڑی فراخدلی سے کہا کہ آپ ضرور میرا خیال کئے بغیر اس پر اپنی رائے کا اظہار کریں، وہاں ان کے ایک عزیز دوست عبدالعلی خانصاحب بھی موجود تھے، جو بلند شہر کے رہنے والے ہیں، انھوں نے بھی ہم لوگوں کی گفتگو میں حصہ لیا.

ونڈسر کاسل

ڈاکٹر کلیم صدیقی سے گفتگو جاری ہی تھی کہ افتخار اعظمی مجھکو اپنی سسرال لے جانے کے لئے آگئے، ان کو اطلاع دیدی تھی کہ میں سلاؤ پہونچ رہا ہوں، وہ ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کے گھر سے تھوڑی دور پر میڈن ہڈ میں رہتے ہیں، وہ اپنی بیوی اور دو بچیوں کے ساتھ آئے، لندن میں ان سب سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، بچپن سے دار المصنفین میں ان کا آنا جانا رہا ہے، اب تو وہ یہاں اردو کے ادیب اور نقاد کی حیثیت سے مشہور ہیں، کئی کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں، انگریزی میں بھی لکھنے کی اچھی مہارت رکھتے ہیں، وہ اپنی سسرال لے چلے تو بولے ونڈسر کاسل بالکل قریب ہے، ذرا اس کو دیکھتے چلیں، یہ کاسل ولیم دی کونکرر نے بنوایا تھا، وہاں پہونچا، تو اس کی صفائی ستھرائی اور ترو تازگی دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حال کی عمارت ہے، صدیوں پہلے ہی تھی، مگر انگریزوں نے اپنی خوش سلیقگی اور اپنی تاریخی عمارتوں کی قدردانی سے اس کو اپنی

پرانی شان کے ساتھ برقرار رکھا ہے، فصیل، پھاٹک، دیواریں، ویسی ہی نظر آئیں جیسی ہمارے یہاں کے قلعوں میں ہوتی ہیں، اگر ہمارے یہاں کے قلعے منہدم نہیں ہونے دیئے جاتے اور جیسے تعمیر ہوئے تھے، ویسے ہی باقی رکھے جاتے تو شاید وہ ونڈسر کاسل کے مقابلے میں فن تعمیر کے لحاظ سے بہتر معلوم ہوتے، انگریزوں کا جب قبضہ دہلی کے لال قلعہ پر ہوا تو اس کے اندر کی بہت سی چیزیں مسمار کر کے اس کی اصل صورت بدل دینے کی کوشش کی، اس وقت اپنے سامراجی جذبہ میں تاریخی یادگاروں کو برقرار رکھنے کا خیال نہیں ہوا، مگر اپنے یہاں کی تاریخی چیزوں کی قدردانی میں ان کا رویہ کچھ اور ہے، اگر ہندوستان میں ساری تاریخی یادگاروں کو اسی طرح برقرار رکھا جاتا، جس طرح ونڈسر کاسل رکھا گیا ہے، تو سیاحوں کے ٹیکس سے بھی ہماری حکومت کو کافی آمدنی ہوا کرتی، مگر یہ ساری تاریخی یادگاریں باہمی تعصب کا شکار ہو گئی ہیں، ہم لوگ ونڈسر کاسل کے اندر نہ جا سکے، کیونکہ شام ہونے کی وجہ سے بند ہو گیا تھا، معلوم ہوا کہ اس کے اندر ایک گڑیا گھر بھی ہے، جس میں برطانیہ کی ملکائیں اپنے بچپن میں جن جن گڑیوں سے کھیلا کرتی تھیں، ان سب کو یہاں محفوظ کر دیا گیا ہے،

افتخار اعظمی کی سسرال پھر ہم لوگ افتخار اعظمی کے سسرالی گھر پہونچے، جہاں ان کے سسر اور ساس سے ملے، ان کے سسر بڑے اچھے مصور بھی ہیں، ہیروز آف اسلام کی ایک سیریز کے ساتھ انھوں نے حضرت خالدؓ، صلاح الدین ایوبی، امام رازی اور ابن سینا کی زندگی کے کچھ واقعات مصور کئے ہیں، ان کو دیکھنے کا بھی موقع ملا، ان کی ساس سے اسلامی طرز حکومت پر بھی کچھ دیر باتیں ہوئیں، وہاں افتخار اعظمی کے ایک دوست ڈیوڈ نگل بھی آئے تھے، وہ ایک اسکول میں استاد ہیں، وہ شاعر بھی ہیں، اور ایک میگزین کے اڈیٹر بھی ہیں، اپنی شاعری کا ایک چھوٹا مجموعہ اور میگزین بھی دیا، اور اپنی شاعری کچھ اپنی زبان سے بھی سنائی، برٹنڈرسل

نیوکلر اسلحہ کے خلاف جو تحریک چلائی ہے، اس کے حامی ہیں، اس کے خلاف احتجاج کرنے میں انکی بیوی گرفتار بھی ہو چکی ہیں، کہنے لگے کہ وہ گاندھی جی سے متاثر ہیں، ان پر ایک نظم بھی لکھی ہے اردو شاعری کے مشاعرے کو وہ پسند کرتے ہیں، شعراء جو ترنم کے ساتھ اپنا کلام سناتے ہیں انکی بھی تعریف کرتے ہیں کہتے تھے کہ وہ اپنی شاعری کو اس ترنم کے ساتھ نہیں سنا سکتے تھے، اثنائے گفتگو میں انھوں نے کہا کہ ہمارے لوگ جب حکومت میں شریک ہو جاتے ہیں تو ہوش و عقل کو کھو بیٹھتے ہیں، اور جب حکومت سے باہر ہو جاتے ہیں، تو پھر وہ صاحب ہوش و حواس ہو جاتے ہیں، افتخار اعظمی نے چائے پلائی، پھر چلتے وقت ان کی بیوی نے بچوں کے لئے انگریزی کی بہت سی کتابیں دیں، جو شکریہ کے ساتھ ہم نے قبول کیں، وہ کہنے لگیں کہ ہندوستان کے ریل کے ڈبوں میں مسافر جو باتیں کرتے ہیں، ان سے مجھکو بڑا لطف آتا ہے، ان کی بچیاں کہتی ہیں کہ ہندوستان میں بڑے بڑے گھر ہوتے ہیں، ہمارے یہاں بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، افتخار اعظمی اپنی بیوی کیساتھ اسٹیشن تک پہونچانے آئے، اور جب گلے ملنے لگے، تو آبدیدہ تھے کہ ہم لوگ ان کے یہاں آکر پرانی نسل کی وضع داری برتی، تقریباً ساڑھے دس بجے رات کو میں اپنی قیامگاہ پر پہنچا، عزیزی ڈاکٹر جاوید شمیم برابر ساتھ رہے، ان کی اس رہنمائی اور سعادتمندی کی قدر رہی،

امپیکٹ میں انٹرویو امپیکٹ کے اڈیٹر جناب ام۔ اے۔ فاروقی صاحب نے ۲۰ ستمبر کو اپنے دفتر میں اصرار سے مدعو کیا، وہاں عزیزی ڈاکٹر جاوید شمیم ہی کیساتھ پہونچا، تو انھوں نے طرح طرح کے سوالات کئے، جو دارالمصنفین، ہندوستان میں اسلامیات کا مستقبل، اسلام کی رواداری، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی رواداری، ہندوستان کے مسلمانوں کی اقتصادی حالت، عالم اسلام کی سیاست وغیرہ کے متعلق تھے، یہ سوال جواب تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک رہا، جسکو وہ ٹیپ کرتے رہے، اسی درمیان میں مولانا عتیق الرحمن سنبھلی مجھکو اپنے گھر لیجانے کیلئے تشریف لائے جو امپیکٹ کے دفتر کے قریب ہی تھا، ایک خوشگوار ملاقات اور چائے کے بعد ہم لوگ مولانا کے گھر پہونچے تو ان کا ڈرائنگ

روم لکھنؤ کا کمرہ بن گیا، اور ہم لوگ بہت سے میٹھے انگور کھا کر اسٹیشن روانہ ہوئے، کیونکہ دوسرے دن ۲/۱ بجے صبح کو میں امریکن ہوائی جہاز سے دہلی روانہ ہونے والا تھا۔

لندن کی زندگی پر ایک تبصرہ

لندن میں ۱۵ روز قیام رہا، اس مدت میں یہ اثر پڑا کہ اصلی عیسائیت تو یہاں کے باشندوں میں ختم ہوچکی ہے، اگر ہے تو کتابوں میں ہے، روزمرہ زندگی میں نہیں ہے، عیسائیت یہاں مذہب کے سہارے نہیں، سیاست کے بل بوتے پر زندہ ہے، میری قیامگاہ سے چند قدم کے فاصلہ پر ایک گرجا تھا، معلوم ہوا کہ اب ویران رہنے کی وجہ سے یہ کمیونٹی سنٹر بنا دیا گیا ہے، یہاں معاشرتی تفریحیں انجام پاتی ہیں، اتوار کے روز بھی یہاں کوئی عبادت نہیں ہوتی ہے، گرجاؤں میں صرف بپتسمہ یا شادی کی تقریب انجام پاتی ہے، بعض گرجاؤں میں اتوار کے روز کچھ بوڑھے اور بوڑھیاں جمع ہوجاتی ہیں، یا لڑکے اور لڑکیاں ترنم سے عبادت کے گیت گانے کے شوق میں چلی آتی ہیں، ٹی. وی پر ایک اتوار کو تو ایک پادری صاحب کا وعظ سننے کا موقع ملا، ان کا موضوع خاندانی زندگی تھا، جو پورے انگلستان میں ختم ہوچکی ہے، شاید اسی پر زور دینے کی خاطر انھوں نے فرمایا کہ خدا کی خاندانی زندگی رہی، جو اس کی ذات یسوع مسیح اور ہولی اسپرٹ پر مشتمل تھی، یسوع مسیح کا خاندان دنیا کے تمام انسانوں کا تھا، جس میں کسی چیز کی تفریق نہیں، اسی کو پھیلا کر پیش کر رہے تھے، جو مجھے تو مضحکہ سا معلوم ہوا، یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ گرجا آسانی سے فروخت کر دیا جاتا ہے، مسلمان، ہندو اور سکھ ان کو خرید کر اپنی اپنی عبادتگاہیں بنا لیتے ہیں، گرجے تو ویران ہو رہے ہیں، لیکن شراب خانے کی چہل پہل باقی ہے، شراب خانہ کو پب (Pub) کہتے ہیں، یہاں رات کو لوگ جمع ہوتے ہیں، اور اس اجتماع کی بڑی اہمیت ہے، اور غزل گویوں کا میخانہ تو خیالی رہا ہے، ساقی بھی ان کے فرضی ہوتے ہیں، مگر جیسی باتیں اردو کی غزل گوئی میں میخانہ اور ساقی کے متعلق کہی جاچکی ہیں، ان سب کا آنکھوں دیکھا حال یہاں کے پب

میں پایا جاتا ہے، اس کی عمارتیں بھی اچھی اور اس کے نام بھی اچھے ہوتے ہیں، انگریزی زبان کے مشہور نثر نگار جانسن کے نام سے بھی پب ہے۔

یہاں کی عورتیں جس قسم کا لباس پہنیں، ان کے لئے روا ہے، فراک، اسکرٹ، کوٹ، پتلون، نیکر، جانگیہ اور چڈی ہر چیز ان کے بدن پر دکھائی دی، بعض عورتیں ایسی بھی دکھائی دیں، جنھوں نے لباس تو ضرور پہن رکھا تھا، لیکن شاید ان کی کوشش یہ رہی کہ ان کے بدن کا کوئی حصہ ڈھکنے نہ پائے، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہاں مرد تو اپنے جسم کے ہر حصہ کو ڈھانکے رہتے ہیں، لیکن عورتیں اپنے جسم کے زیادہ سے زیادہ حصہ کو کھلا رکھنا پسند کرتی ہیں، سڑکوں پر عورتوں کے لباس میں یکسانیت نہیں دیکھی، کچھ نہ کچھ ایک دوسرے سے فرق نظر آیا، ان کے سر کے بال میں اب مانگ نہیں ہوتی، بال رکھنے کے اتنے نمونے دیکھنے میں آئے کہ اس تنوع پر بڑا تعجب ہوا، ان عورتوں میں ستر پوشی، حیا، شرم، عصمت اور عفت کا جو معیار اور تخیل ہے، وہ ہم ہندوستانیوں کی سمجھ سے باہر ہے، سڑکوں، پارکوں، ہوٹلوں میں اس اختلاط کے ایسے مناظر دیکھنے میں آئے کہ ندامت سے آنکھیں جھک گئیں، بڑی بڑی دوکانوں میں بڑے بڑے بورڈ پر جلی حروف میں یہ لکھا ہوا دیکھا کہ یہ جنسیات کے بین الاقوامی مرکز ہیں، معلوم نہیں وہاں کیا ہوتا ہے، جنسی تصویروں کی خریداری تو کسی جھجک کے بغیر عام طور سے ہوتی ہے، ایک اخبار میں ایسا اشتہار بھی دیکھا کہ ایسے حسین لڑکوں اور لڑکیوں کی ضرورت ہے، جو اسٹیج پر ننگے نمودار ہوسکیں، ان کے لئے بڑی بڑی تنخواہوں کا اعلان تھا، ایک رسالہ ایشین پوسٹ کے ایک مضمون میں امرد پرستی کی پوری تفصیل تھی،

سولہ برس کے سن کے بعد لڑکے اور لڑکیاں والدین کے اخلاقی اور معاشرتی دباؤ سے آزاد سمجھی جاتی ہیں، وہ جیسی زندگی چاہیں بسر کریں، والدین کو روک ٹوک کرنے کا حق نہیں ہوتا، وہ اپنی تعلیم کا انتظام خود کریں، خود ملازمت ڈھونڈھیں، اور خود اپنے لئے جوڑا تلاش کریں، جوڑا

تلاش کرنے میں بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ کا ہونا یہاں کی معاشرت کا ضروری جزہے، ایک لڑکی کئی بوائے فرینڈ اور ایک لڑکا کئی گرل فرینڈ رکھتا ہے، پھر ان ہی میں سے کسی کی کسی سے شادی ہوجاتی ہے، اس تلاش میں عصمت وعفت کو برقرار رکھنے کی کوئی قید نہیں، جس روز ہم لوگ لندن پہونچے اسی روز اخبار میں دیکھا کہ یہاں تیس لاکھ بچے بن باپ کے پیدا ہوئے، عزیزی ڈاکٹر محمد فاتح نے بتایا کہ ان کی سرجری (یعنی مطب) میں ایسی عورتیں بھی آتی ہیں جو کسی جھجک کے بغیر کہتی ہیں کہ وہ اپنے بوائے فرینڈ سے حاملہ ہوگئی ہیں یا کسی بوائے فرینڈ سے کوئی بچہ پیدا ہوجاتا ہے تو اس کا بھی آکر اقرار کردیتی ہیں، اگر کسی سے شادی ہوجاتی ہے تو شوہر اپنی بیوی کے بوائے فرینڈ کے بچے کو اپنے لئے گوارا کرلیتا ہے: اور اگر کوئی لڑکی الگ تھلگ رہتی ہے، بوائے فرینڈ رکھنا پسند نہیں کرتی تو والدین کو تردد ہوجاتا ہے کہ اس میں کچھ ایسی کمی ہے جس کا علاج کرانے کی ضرورت ہے، اور وہ اپنے حلقہ کے ڈاکٹر سے رجوع کرتے ہیں۔

بوائے فرینڈ سے بچے تو اتفاق سے پیدا ہوجاتے ہیں، ورنہ احتیاط کے اتنے طریقے ہیں کہ اس کی شرح خود بخود کم ہوجاتی ہے، اگر یہ طریقے نہ ہوں تو معلوم نہیں ناجائز بچوں کی تعداد کتنی بڑھ جائے، یہ بھی سننے میں آیا کہ جائز اور ناجائز بچوں کی تفریق ختم کرنے کی خاطر یہاں کی پارلیمنٹ میں شاید یہ بل بھی آجائے کہ شادی بیاہ کی رسمی بندھن کو ختم ہی کردیا جائے، اور یہ بل تو یہاں کی پارلیمنٹ میں پہلے منظور ہوچکا ہے کہ مرد مرد اور عورت عورت سے شادی کرسکتی ہے،

ان تمام معاشرتی گمراہیوں اور بے راہ رویوں کو روکنے میں عیسائیت مجبور محض ہوچکی ہے کیونکہ یہاں کی سوسائٹی پر سے اس کی گرفت ختم ہوچکی ہے، پوپ، ارک، بشپ، اور پادری ہاتھ پر ہاتھ دھرے یہ سب کچھ تماشے دیکھتے رہتے ہیں، مگر ان پر روک ٹوک نہیں لگا سکتے، یہاں کے لوگوں نے اپنی زندگی کے جو ضابطے بنالئے ہیں وہی ان کا مذہب بن گیا ہے، وہ اب اس کی فکر نہیں کرتے کہ یہ

عیسائی مذہب کی تعلیم کے مطابق ہے بھی کہ نہیں، عیسائی پادری جو دو سو سال سے اسلام پر یہ اعتراض کرتے آئے ہیں کہ اسلام نے چار بیویوں کے رکھنے کی اجازت دے کر نسوانیت کی تذلیل کی ہے، مگر آج جب لندن کیا پورے یورپ میں نسوانیت کی جس طرح تضحیک ہورہی ہے، اس سے عیسائیت شرمندہ نہیں، سڑکوں پر، پارکوں میں، ہوٹلوں کے اندر اور ڈسکو میں یہ عورتیں اور لڑکیاں کھلونا بنی رہیں، متعدد بوائے فرینڈ کی ہوسناکی کا شکار رہیں، بکثرت ناجائز بچوں کی مائیں بن جائیں، اس میں نسوانیت کی تحقیر نہیں، بلکہ یہ انسانی رواداری اور تہذیبی آزادی کی جلوہ گری سمجھی جائے، بار بار خیال ہوا کہ جہاں مذہب ایسا بے بس اور عاجز ہوچکا ہو، وہاں کا معاشرہ کب تک صحت مند اور توانا رہ سکتا ہے اس کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کرسکتا ہے۔

ایسی معاشرت میں والدین کو کم از کم ایک ایسا ذہنی سکون حاصل ہوگیا ہے، جو ہمارے برصغیر کے والدین کو حاصل نہیں، یہاں کے اخلاق کردار اور خصوصاً عصمت وعفت کا جو معیار بن گیا ہے اس میں والدین کو یہ فکر نہیں ہوتی کہ ان کی اولاد بے راہ روی نہ اختیار کرے، ہمارے برصغیر میں کوئی لڑکا اور خصوصاً کوئی لڑکی ذرا بھی بے راہ روی اختیار کرتی ہے تو پورے خاندان کی عزت وناموس پر حرف آجاتا ہے، اس عزت وناموس کے تحفظ کی خاطر پورے خاندان پر مستقل ذہنی دباؤ رہتا ہے، لندن کے والدین پر یہ ذہنی دباؤ نہیں رہتا، ان کی اولاد جیسی بھی بے راہ روی اختیار کرے، ان پر کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی، مگر اس سے وہ خاندانی زندگی کی روحانیت سے محروم ہوچکے ہیں، والدین جب بوڑھے ہوجاتے ہیں تو ان کو اپنی اولاد سے کوئی راحت نہیں پہونچتی، ایک ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ یہاں بوڑھا ہونا سب سے زیادہ عبرتناک اور المناک ہے، ان کے بڑھاپے کا شفیق دوست سرکاری ڈاکٹر ہوتا ہے، اور ان کی پناہ گاہ گھر کے بجائے سرکاری اسپتال ہے، ان کے حال زار کی خبر ان کے لڑکوں کو دی جاتی ہے، تو وہ بلا تکلف کہہ دیتے ہیں کہ ان کو اپنے گھر اور فیملی کو دیکھنے سے اتنی کہاں فرصت کہ وہ والدین

کے پاس پہونچ کر ان کی خبر گیری کریں، وہ سوچ نہیں سکتے کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے عیسائیت
ان کو والدین کے حقوق کو ادا کرنے کی تعلیم دینے سے بے بس ہو چکی ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان
ہے کہ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے
ہو کر رہیں تو انھیں اُف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات
کرو، اور نرمی اور رحم کے ساتھ جھک کر رہو، اور دعا کیا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح
انھوں نے رحمت وشفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا (بنی اسرائیل، رکوع ۱۲، پارہ ۱۵)
مسلمانوں کے معاشرہ میں اسی پر عمل ہے، اس لحاظ سے وہ عیسائیوں کے معاشرہ پر فضیلت
رکھتے ہیں۔

یہاں خاندانی زندگی ختم ہوجانے کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کو اپنے مکان سے وہ محبت نہیں ہوتی
جو ہم ہندوستانیوں کو ہوتی ہے، وہ مکان اس لئے نہیں بناتے کہ اس میں اگلے خاندان والوں کو ہمیشہ رہنا ہے
وہ اس لئے بناتے ہیں کہ اپنی آخری زندگی میں اس کو فروخت کر دیں گے، وہ ہاؤس بلڈنگ سوسائٹی
سے آسان شرطوں پر قرض لے کر مکان بنا لیتے ہیں، آخر میں اس کو فروخت کر دیتے ہیں، تو قرض ادا
کر دینے کے بعد بھی کچھ سرمایہ ان کے پاس بچ جاتا ہے، مکان فروخت کرنا یہاں اچھی تجارت بھی
ہے، اسی لئے جا بجا For Sale کی تختیاں لگی رہتی ہیں، والدین کی اولاد کو ان کے مکان سے
اس لئے بھی دلچسپی نہیں ہوتی ہے کہ یہ تو فروخت ہونے کو ہے، بوڑھے والدین اپنی راحت اور سہولت
کی خاطر بہت کچھ خرچ کرتے رہتے ہیں، اس لئے وراثت میں ان کی اولاد کو بہت کچھ ملنے کی امید
نہیں ہوتی۔

لندن کی زندگی کے تاریک پہلوؤں کے مقابلہ میں اس کے روشن پہلو بہت زیادہ ہیں، تب
ہی تو یہ قوم برٹش امپائر کھو دینے کے بعد بھی ایک طاقتور قوم بنی ہوئی ہے، کسی انگریز کے گھر میں چلا جائیے

اس کی ہر چیز میں صفائی ستھرائی نظر آئے گی، صفائی ان کی قومی خصوصیت بن گئی ہے، گھر کے فرش
پر اچھی فٹنگ ہوگی، ساری چیزیں سلیقہ سے رکھی ہوں گی، آرام اور سہولت کے تمام سامان ہونگے،
ٹیلیفون، ٹی. وی. ریفریجیٹر ضرور ہوں گے، اسی کے ساتھ اوون ہوگا جس سے کھانے کی چیزیں
گرم کی جاتی ہیں، ایک بوائلر بھی ہوگا، جس سے مکان گرم رکھا جا سکتا ہے، بے سن کے نل میں ٹھنڈے
اور گرم پانی دونوں آتے ہیں، باورچی خانہ میں بجلی کا ایسا انتظام ہوگا، جس وقت چاہئے چولھا
جلا لیجئے، کھانا پکانے کی ایسی آسانیاں ہیں کہ عورت مرد لڑکے لڑکیاں جب چاہیں کھانا فوراً تیار
کر لیں، کھانے کی ہر چیز یہاں خالص ڈبوں اور بوتلوں میں پیک کی ہوئی ملتی ہے، ملاوٹ نام
کو نہیں، جس ملک کے پھل کھانا چاہیں آسانی سے مل جاتے ہیں، پھلوں کے کھانے کا یہاں بہت
رواج ہے، ہر قسم کے پھلوں کا عرق وٹامن کے ساتھ بوتلوں اور ڈبوں میں ملتا ہے، ہر گھر میں تفریح
کے سامان موجود ہیں، اب تو Video Cassette سے ٹی وی پر دنیا بھر کی فلمیں دیکھی
جا سکتی ہیں، یہاں کے ٹی وی کے تین اسٹیشن ہیں، جو ایک ساتھ چلتے رہتے ہیں، ان کے ذریعہ
سے دنیا کے تمام ملکوں کی سیر ہو جاتی ہے، ان سے خبریں براڈکاسٹ کیا ہوتی ہیں، بلکہ جن واقعات
سے متعلق خبریں ہوتی ہیں، ان کو اپنی آنکھوں سے خود دیکھ لیجئے، یہ سٹلائٹ کا ادنیٰ کارنامہ ہے،
رپورٹر کھڑا ہو کر خبریں سناتا ہے، اور اس کے پیچھے سارے واقعات آنکھوں سے دیکھتے ہیں
لڑائی، دنگے فساد، ہوائی جہاز کی بمباری، سمندر کے اندر کی مچھلیاں، جنگلوں کے جانور کیڑے
مکوڑے سب آنکھوں سے دیکھ لیں، فوٹو گرافر کا آرٹ تو انتہائے کمال کو پہونچ گیا، بے جان
چیزوں، کھلونوں، کپڑوں کے پرندوں، جانوروں اور گڑیوں میں حرکت اور آواز پیدا کر دینے
کا پورا آرٹ نشو ونما پا گیا ہے، اتوار اور بدھ کو ہندوستان اور پاکستان والوں کے ذوق کے
مطابق بھی پروگرام ہوتا ہے، جس میں غزلیں بہت گائی جاتی ہیں، ان کے گانے والوں میں ہندو

اور بنگالی ہند دبھی دیکھے جاتے ہیں.

یہاں رات صحیح معنوں میں شبستانِ عیش ہوتی ہے، موسیقی اور رقص تو یہاں کے تمدن کا خاص جزء ہے، اگر رات کی رندی اور سرمستی کے بعد بھی لوگ صبح کو کام کرنے کے لئے دیو اور جن کی طرح باہر نکلتے ہیں، دن کو ہر شخص کام کو اپنا دیوتا بنا کر اس کی پرستش شروع کر دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صنعت ہو، حرفت ہو، تجارت ہو، سرکاری دفتر ہو، اسپتال ہو، ریل چلانا ہو، بس ڈرائیوری ہو، سڑک کی صفائی ہو، ہر شخص کام اس طرح کریگا، جیسے اس میں اگر اس سے کچھ بھی کوتاہی ہوگئی تو اس کی مغفرت نہ ہوگی، کام کرنے میں محنت اور دیانتداری اور احساس ذمہ داری ان کی قومی خصوصیات ہیں، ان کو کام کرنے میں آسانی اس لئے بھی ہوتی ہے کہ سائنس کی طرح طرح کی ایجادات سے ان کو ہر قسم کی سہولتیں میسر ہیں، مشین سے وہ حساب کتاب بھی کر لیتے ہیں، صرف بٹن دباکر معلوم نہیں کیا کیا بڑے بڑے کام انجام دے لیتے ہیں، کمپیوٹر نے تو ہر مشکل کام کو آسان کر دیا ہے، جو کام ہم لوگوں کو بہت مشکل ہوتا ہے، وہ وہاں بہت آسان ہے، اسی لئے وہ کام کرتے وقت تھکتے نظر نہیں آتے، انھوں نے موجودہ تمدن کو کیا کیا چیزیں نہیں دیں، ان کا شمار کرنا آسان نہیں، اسلحہ، فیکٹریوں کی طرح طرح کی مشین، ہوائی جہاز، طرح طرح کی دوائیں، سرجری کے کارنامے، سائنس کی ایجادات، علوم و فنون کو فروغ اور خدا جانے کیا کیا چیزیں دیں، لندن کے ہر طرف ان کے کارناموں کے کرشمے نظر آتے ہیں، اور یہ کرشمے دکھلانے والے وہی ہیں جن کے جنسی اخلاق کے مظاہرے دیکھ کر آنکھیں میچ لینے کو جی چاہتا ہے، یہاں کے لوگوں کی صحت دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے پاس امراض آتے ہوئے ڈرتے ہوں گے، یہاں کے بعض مزدوروں کو ننگے بدن کام کرتے دیکھا، لیکن ان کا جسم لوہے کی طرح ڈھلا معلوم ہوا، یہاں کی عورتیں بھی بہت تندرست نظر آئیں، اسی لئے ہر کام میں مردوں کے شانہ بشانہ نظر آئیں، کھیل کا میدان ہو، گھوڑ دوڑ ہو، موٹر چلانا ہو،

پہاڑوں پر چڑھنا ہو، دریا میں تیرنا ہو، ہر جگہ وہ نظر آتی ہیں، مزدوروں کے ساتھ مزدوری کرتی نہیں دکھائی دیں، وہ زیادہ تر ہر شعبہ کے دفتروں، دکانوں اور اسپتالوں وغیرہ میں کام کرتی دکھائی دیتی ہیں، لیبر کلاس کی عورتیں بھی اپنی پوشاک اور وضع قطع میں بظاہر اچھے کلاس کی معلوم ہوتی ہیں، شاید ہی کسی عورت کا ناک نقشہ اور چہرہ مہرہ بد وضع اور بدنما ہو، بہت عمدہ لباس پہن لیں تو اونچے خاندان کی معلوم ہونے لگیں،

یہاں سڑکوں پر بمبئی اور کلکتہ کی بھیڑ بھاڑ نہیں دیکھی، اس کی ایک وجہ تو یہ بھی ہے کہ زیادہ تر حصوں میں زمین دوز ریل چلتی ہے، جو اوپر کی سڑکوں کی بھیڑ بھاڑ کو کم کر دیتی ہے، ٹریفک کا انتظام بہت عمدہ ہے، سڑکوں کے چوراہے پر کہیں پولیس نظر نہیں آئی، مگر یہی پولیس قانون کی سب سے بڑی محافظ سمجھی جاتی ہے، لوگوں کو اپنی پولیس پر بڑا اعتماد اور اعتبار ہے، اس کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے ہیں، اس لئے اس سے بڑے احترام سے پیش آتے ہیں، اور پولیس بھی لوگوں کی ہر قسم کی مدد کے لئے مستعد رہتی ہے، جب کسی اہم کام کے لئے اس کی موٹر روانہ ہوتی ہے تو خاص قسم کے گھنٹے بجائے جاتے ہیں، جس سے ٹریفک چوکنا ہو کر اس کے لئے راہ چھوڑ دیتی ہے، میرے قیام کے زمانے میں تین بدمعاشوں نے چھ برس کے ایک بچہ کے ساتھ نازیبا حرکت کی، جس سے قوم پر بڑا دھبہ آیا، مگر اسی قوم کے ایک فرد نے ان مجرموں کو تلاش کر کے پکڑنے کے لئے پچپن ہزار پونڈ کے انعام کا اعلان کیا، اور ٹی. وی پر پولیس ان مجرموں کی تلاش میں جس طرح سرگرم اور متحرک دکھائی گئی تو معلوم ہوتا تھا کہ لندن میں کوئی ایٹم بم گر گیا ہے، اس کی خاطر پولیس باہر نکل پڑی ہے، پولیس کے عہدہ داروں میں عورتیں بھی ہوتی ہیں،

ہندوستان کے مقابلہ میں لندن بہت گراں معلوم ہوا، مگر دولت کی فراوانی کی وجہ

یہاں گرانی محسوس نہیں ہوئی، میرے ایک عزیز ڈاکٹر نے بتایا کہ اسپتال میں ایک روز اوور ٹائم کرنے میں ایک سو بیس پونڈ ملتا ہے، تنخواہیں سنکر حیرت ہوتی ہے، ایک مزدور ایک ہفتہ میں ایک سو پونڈ ضرور پا لیتا ہے، اسی لئے یہاں کے لوگ ایک پونڈ اس طرح خرچ کرتے ہیں جیسے ہم لوگ ایک روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ حالانکہ ایک پونڈ پندرہ سولہ روپے کے برابر ہوتا ہے، ایک بار مجھکو ایک ڈیڑھ میل ایک ٹیکسی پر جانا پڑا، تو ڈیڑھ پونڈ ادا کرنا پڑا، اس کے مقابلہ میں ٹیوب ٹرین کا کرایہ سستا تھا، میں نے ایک سفر اس پر ۴۵ منٹ کا کیا، تو ڈیڑھ پونڈ ہی ادا کرنا پڑا، مگر ہندوستان کے مقابلہ میں یہ بھی بہت گراں تھا، گائے کا گوشت ایک پونڈ بیس پینی میں، ایک پونڈ (یعنی آدھا کیلو) بکرے کا گوشت ۹۰ پینی فی پونڈ اور مرغ کا گوشت ۹۴ پینی فی پونڈ ملتا ہے، چاول دو پونڈ ۵۴ پینی میں پانچ پونڈ، بیگن ۰ ۸ پینی فی پونڈ، بھنڈی ۹۵ پینی فی پونڈ، انگور ۵ ۸ پینی فی پونڈ ملتا ہے، ایک آم کی قیمت ایک پونڈ لکھی دیکھی، سو پینی کا ایک پونڈ ہوتا ہے، اور ایک پونڈ ہندوستانی سکہ سے تقریباً سولہ روپے کے برابر ہے، بعض قمیص کی قیمت تین سو پونڈ لکھی دیکھی،

اس گرانی کے باوجود دنیا کی ہر چیز وہاں ملتی ہے، اب تو لہسن، پیاز، دھنیا، مرچا، سودا وغیرہ بھی ملنے لگا ہے، ہندوستانی مٹھائیوں اور حلوے کی ہر قسم وہاں دستیاب ہے۔

دار المصنفین کی ادبی خدمات

اگرچہ دار المصنفین کا دائرہ کار حدیث و فقہ، کلام و عقائد، شعر و ادب، تاریخ و فلسفہ، سائنس و طبیعیات تک وسیع ہے، اور اس نے ان میں سے ہر موضوع پر بیش بہا کتابیں شائع کی ہیں، لیکن ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی کی یہ کتاب دار المصنفین کی ادبی خدمات پر ہے، یعنی شعر و ادب سے متعلق اس نے جو خدمات انجام دی ہیں، اس میں اس کی تفصیل ہے، قیمت: بیس روپیے،

"منیجر"

ادبیات

غزل

از جناب قمر سنبھلی (دہلی)

فضا میں گونج کے تارِ صدا بھی ٹوٹ گیا
لبوں پہ آتے ہی حرفِ دعا بھی ٹوٹ گیا

شکست ہو گیا پندارِ تابِ نظارہ
تمھارے سامنے زعمِ انا بھی ٹوٹ گیا

بہت سنبھال کے رکھا تھا حسین عکس ترا
پڑا جو وقت تو وہ آئینہ بھی ٹوٹ گیا

حسین خواب مقید تھے بند آنکھوں میں
جو نیند اُچٹی تو یہ رابطہ بھی ٹوٹ گیا

دکھے ہوئے تھی اِک آواز مجھ کو حرکت میں
یہ سانحہ ہے کہ وہ آسرا بھی ٹوٹ گیا

بڑا حسین سہارا تھا زندگی کے لیے
اب انتظار کا وہ سلسلہ بھی ٹوٹ گیا

سنبھالتی مرے لہجے کی شعلگی کب تک
ہوا کے دوش پہ نقشِ نوا بھی ٹوٹ گیا

نہ ہو امید فریبوں کا آسرا ہی سہی
رہے گا کیا جو قمرؔ حوصلہ بھی ٹوٹ گیا

غزل

از جناب وارث ریاضی صاحب مغربی چمپارن

سجدے میں سر کے ساتھ اگر دل جھکا نہیں
وہ سجدۂ نمازِ محبت ہوا نہیں

جب سے کیا ہے اپنے گنا ہوں کا احتساب
میری نگاہ میں کوئی مجھ سے بُرا نہیں

کچھ کم نہیں عذاب سے دنیا کی الجھنیں
یارب! مرے گنہ کی جہنم سزا نہیں

شمس و قمر کا نور، ستاروں کی روشنی
کوئی چراغِ دل کی طرح رہنما نہیں

جانے ہیں اپنے آپ کو گم کر دیا کہاں؟
مدت سے ڈھونڈتا ہوں مگر کچھ پتہ نہیں

یوں تو جہاں میں لاکھ اٹھائے ہیں رنج و غم
لیکن کسی کا ہم سے کبھی دل دکھا نہیں

سینچا گئے ہیں دیدۂ پُرنم سے عمر بھر
اک پھول بھی وفا کے چمن میں کھلا نہیں

حسن و جمال، مست خرامی، غرور و ناز
سب کچھ بلا انھیں، دلِ دردآشنا نہیں

تیری نوازشوں کی قسم! اے ہجوم یاس!
کوئی بھی حوصلہ مرے دل میں رہا نہیں

ذکرِ حبیب، دیدۂ پُرنم، گداز دل
وارث مرے خدا نے مجھے کیا دیا نہیں

غزل

از جناب بسنت کمار بسنت، ایڈوکیٹ، ۳۹، ٹیڑھی بازار، رکاب گنج لکھنؤ

نہ سمجھ سکے گی دنیا، میری زیست کا فسانہ
کبھی گردشِ مقدر، کبھی گردشِ زمانہ

رگِ تاک کی طرح ہیں تیرے دونوں دستِ سیمیں
تری نیم باز آنکھیں ہیں درِ شراب خانہ

کوئی نقش سادہ سادہ کوئی نقش شوخ و رنگیں
یہی سرگذشتِ دنیا، یہی عشق کا فسانہ

کبھی چھڑ گئی کسی سے کوئی داستانِ الفت
کبھی ہو گیا کسی سے کوئی ربطِ غائبانہ

ترے بکھرے بکھرے گیسو، یہ ادا یہ رنگ و خوشبو
یہ کشش یہ تیرا جادو، تیرا عالمِ یگانہ

ترا حسن کیف آگیں، مرا عشق غم سراسر
تری زندگی حقیقت، مری زندگی فسانہ

مرا شعر فن سے مملو، ہے بسنت اس میں جادو
رہِ حق کا میں ہوں رہرو، ہے کلام عارفانہ

مطبوعاتِ جدیدہ

ایک مسافر چار ملک: ۔ مرتبہ حکیم محمد سعید صاحب، کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ، صفحات ۵۰۲ مجلد مع گرد پوش قیمت ساٹھ روپے، پتہ۔ ہمدرد اکیڈمی، ہمدرد فاؤنڈیشن، ہمدرد سنٹر کراچی - ۱۸ -

پاکستان میں حکیم حافظ محمد سعید دہلوی کی مساعی جمیلہ سے طب یونانی کا چراغ مخالف ہواؤں میں بھی روشن ہے، ان کی علم دوستی، جذبۂ خدمت، جوش عمل، فیض بخشی اور نفع رسانی کی وجہ سے گوناگوں مفید علمی، مذہبی، قومی، ملی، طبی اور رفاہی کام انجام پا رہے ہیں، جن کے لئے وہ برابر بیرونی ملکوں کا سفر کرتے رہتے ہیں، ان کو متعدد بین الاقوامی سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کا موقع بھی ملا ہے۔ اور بعض اہم بین الاقوامی اجتماع خود ان کے زیر انتظام بھی منعقد ہو چکے ہیں۔

وہ اردو اور انگریزی کے اچھے اہل قلم ہیں اور کئی بیرونی ملکوں کے دلچسپ سفرنامے پہلے لکھ چکے ہیں، یہ کتاب بھی ان کے چار ملکوں کے سفر کا روزنامچہ ہے۔ ستمبر ۷۹ء میں حکیم صاحب انٹرنیشنل کانفرنس آن ایشین ٹریڈیشنل میڈیسن میں شرکت کے لئے آسٹریلیا گئے پھر پیرس، لندن اور سوئٹزرلینڈ تشریف لے گئے۔ اس کتاب میں ان سب جگہوں کی روداد سفر قلمبند کی ہے۔ اس کے بعد وہ ۱۹۸۰ء میں قرآن کانگریس میں شرکت کے لئے دوبارہ آسٹریلیا تشریف لے گئے آخر میں اس سفر کا روزنامچہ اور اجلاس کی مکمل کارروائی لکھی ہے، شروع میں پاکستان میں کراچی کے قیام اور راولپنڈی اور اسلام آباد وغیرہ میں آمد و رفت کی ڈائری بھی قلمبند کی ہے، یہ کتاب

محض چند ملکوں کے سفر کا روزنامچہ نہیں ہے بلکہ حکیم صاحب کی مشغول، سرگرم، متحرک اور فعّال زندگی کے شب و روز کے معمولات کی داستان بھی ہے۔ اور اس سے ان کی قلمی و تحریری سرگرمیوں، علمی، دینی، طبی اور ملی شغف، پاکستان کے تعمیری، فلاحی اور ترقیاتی کاموں میں دلچسپی اور مخلصانہ جد و جہد، مختلف قومی و بین الاقوامی امور و مسائل سے ان کی باخبری کے علاوہ ان کے بارہ میں ان کے غور و فکر اور صحتمند نقطۂ نظر کا بھی پتہ چلتا ہے۔ حکیم صاحب جہاں تشریف لے گئے وہاں کے قدرتی و جغرافیائی، تاریخی، سیاسی اور معاشرتی حالات بھی لکھے ہیں۔ خوبصورت شہروں، قابل دید عمارتوں، مسجدوں اور ریلوں کا ذکر کیا ہے، شہری زندگی کے معمولات، اہم واقعات، عجیب و غریب چیزوں یہاں تک کہ جانوروں اور پرندوں کے بارہ میں بھی معلومات بیان کئے ہیں اور مختلف اصحاب علم سے اپنی ملاقات اور ان سے اہم معاملات پر بحث و گفتگو کی روداد تحریر کی ہے، اجتماعات اور کانگرسوں کے اجلاس کی کارروائی، تقریروں، تجویزوں اور مقاصد وغیرہ کا خلاصہ بھی دیا ہے، اس کی وجہ سے یہ روزنامہ دلچسپ اور پُر از معلومات ہو گیا ہے۔ طب یونانی سے حکیم صاحب کو دلچسپی ہی نہیں عشق ہے، اس کا احیار و ترقی ان کی زندگی کا خاص مشن ہے، وہ اس زمانہ میں بھی اسی کا بول بالا چاہتے ہیں، اس لئے طب اور اس کے مسائل پر انھوں نے بار بار اظہار خیال کیا ہے۔ اور اس کے فطری اصول علاج کی تلقین کی ہے۔ اور صحت بخش غذاؤں کی نشاندہی کی ہے، اسٹریلیا میں خالص غذا ملنے پر اظہار اطمینان کیا ہے۔ اور اپنے ملک میں غذاؤں میں ملاوٹ پر فکرمندی اور تشویش ظاہر کی ہے، حکیم صاحب کی ڈائری میں کہیں کہیں پاکستان کے سیاسی حالات، داخلی و خارجی مسائل، نظم و نسق کی خرابی، سیاستدانوں کے غلط طرز فکر و عمل، بعض مذہبی و سیاسی جماعتوں اور اخبار و رسائل، تعلیمی پسماندگی، طلبہ کی بے راہ روی، تعلیم گاہوں کے ابتر حالات،

شہری زندگی کے مسائل اور دشواریوں نیز صفائی اور صحت کی جانب سے بے توجہی وغیرہ کا ذکر بھی آگیا ہے، اور ان کی اصلاح و درستگی کے لیے مشورے، تجویزیں اور تجربات بھی پیش کئے گئے ہیں، حکیم صاحب کے دل میں دین کا درد بھی ہے، اس روزنامچہ سے ان کے دینی ذوق، اور اوراد و وظائف کی پابندی اور صوم و صلوٰۃ کے اہتمام کا پتہ بھی چلتا ہے۔ اس دلچسپ سفرنامہ میں حکیم صاحب کی مشغولیت، فرض شناسی، کارگذاری، جوشِ عمل، جذبۂ خدمت، ہمدردی اور شرافت کے جلوے بھی نظر آتے ہیں۔

حیات حافظ:- مرتبہ - مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوریؒ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت عمدہ، صفحات ۹۶ مع حسین جلد، قیمت پندرہ روپے۔ پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی۔

مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری مرحوم کا خاص موضوع تفسیر، تاریخ اور سیر تھا۔ لیکن وہ شعر و ادب اور فارسی زبان کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے، انھوں نے اپنی تصنیفی زندگی کے شروع میں حافظ و جامی کے جو تذکرے لکھے تھے، وہ مقبول ہوئے، اب مکتبہ جامعہ نے "حیات حافظ" کا نیا اڈیشن اپنے روایتی معیار کے مطابق بہت دیدہ زیب شائع کیا ہے، یہ کتاب خواجہ حافظ شیرازی کے حالات و کارناموں کا مختصر مرقع ہے، اس میں ان کے نام و نسب، خاندانی حالات، تعلیم، شاعری کی ابتدا، عہد و ماحول اور امرار و سلاطین سے ان کے تعلق کا حال بھی تحریر کیا ہے۔ اور فضل و کمال، شہرت و عظمت، زہد و تقدس، اخلاقی خوبیوں، حب الوطنی اور وفات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اور آخر میں دیوان پر مبسوط تبصرہ ہے اس کے شروع میں حافظ کے ایک حاشیہ کا بھی ذکر ہے۔ جو انھوں نے علامہ زمخشریؒ کی شہرۂ آفاق تفسیر کشاف پر لکھا تھا۔ دیوان میں الحاق پر گفتگو کے علاوہ مختلف مطبوعہ نسخوں، شرحوں اور

ترجموں کی نشاندہی اور کلام کی خصوصیات دکھائی ہیں، اس ضمن میں خواجہ حافظ کے صوفیانہ اور اخلاقی مضامین، کلام کی سلاست، شوخی تصویر کشی، بدیع الاسلوبی، سعدی سے مقابلہ اور مختصر انتخاب بھی دیا ہے، اور اس کے متعلق اصحاب کمال کی رائیں نقل کی ہیں، اور اس کی مقبولیت، اثر انگیزی اور اس سے فال نکالنے کے واقعات نقل کئے ہیں، حافظ کے جوش بیان، حسن اسلوب، جدت ادا اور اچھوتے انداز نے ان مضامین کو بھی دلفریب اور پرکشش بنا دیا ہے، جن میں بظاہر کوئی ندرت اور دلفریبی نہ تھی اس لئے ارباب ذوق ان کے کلام پر وجد کرتے ہیں، مولانا محمد اسلم مرحوم نے والہانہ انداز میں یہ کتاب لکھکر دوسروں کو بھی بادۂ شیراز کے لطف وکیف اور سرور ومستی میں شریک ہونے کا سامان مہیا کیا ہے، مولانا نے دیوان حافظ کے انہی نسخوں سے اشعار نقل کئے ہیں جو ان کے زمانہ میں متداول تھے، جناب ضیاء الحسن فاروقی نے حواشی میں بعض اشعار کے متعلق صراحت کی ہے کہ وہ موجودہ محققین کے مرتب کردہ دواوین میں موجود نہیں ہیں۔

محمد اقبال :- از میر سید میر شکر، مترجم جناب کبیر احمد جائسی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۳۰، قیمت اٹھارہ روپے، ناشر اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی نے ڈاکٹر محمد اقبال، ان کے افکار و تصورات اور دلچسپی کے موضوعات پر مفید کتابوں کی اشاعت کے علاوہ دوسرے ملکوں اور زبانوں میں ہونے والے ان پر مفید کاموں کے اردو ترجمے شائع کرنے کا پروگرام بھی بنایا ہے، ڈاکٹر کبیر احمد جائسی کو اقبالیات سے دلچسپی کے علاوہ فارسی کتابوں کے ترجمے کا اچھا سلیقہ بھی ہے۔ اقبال مصلح قرن آخر کے نام سے ان کی ایک کتاب گذشتہ برس شائع ہوئی تھی جو ایران کے ڈاکٹر علی شریعتی کے ایک خطبہ کا اردو ترجمہ ہے۔ اب انھوں نے تاجکستان کے ایک ادیب و شاعر میر سید میر شکر کے اس مقالہ کا اردو ترجمہ کیا ہے۔

جو اقبال کے فارسی کلام کے ایک مجموعہ پر بطور دیباچہ لکھا گیا تھا، اس میں پہلے اقبال کے مختصر سوانح حیات قلمبند کئے گئے ہیں، پھر ان کی شاعری کے چار دور قائم کرکے ہر ایک پر اظہار خیال کیا ہے، گو مقالہ نگار کی واقفیت اقبال سے زیادہ نہیں ہے، اور انھوں نے اپنے مخصوص رجحان اور زاویۂ نظر کے مطابق انھیں پیش کیا ہے، تاہم ایک تاجکستانی ادیب کے خیالات پر مشتمل اور اس کی اقبال سے دلچسپی کا نتیجہ ہونے کی بنا پر یہ تحریر اہمیت سے خالی نہیں تھی، جناب کبیر احمد جائسی نے محض اس کے ترجمہ کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ اس پر شروع میں ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے، اور آخر میں مفید تعلیقات بھی لکھی ہیں، مقدمہ میں میر شکر کے حالات زندگی اور علمی و ادبی کمالات پر خاطر خواہ بحث کے علاوہ میر شکر کے عہد و ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے تاجکستان اور وسط ایشیا کے حالات بھی لکھے ہیں اور ان کے ضمن میں وہاں کی سیاسی و انقلابی تحریکوں اور اشخاص کا تذکرہ بھی کیا ہے، جو دلچسپ اور پر از معلومات ہے، مقدمہ کے آخر میں مقالہ کے مشمولات پر سیر حاصل بحث کرکے اس کے اسقام اور ان گوشوں کی نشاندہی کی ہے جو تشنہ رہ گئے ہیں، اس سلسلہ میں اقبال کے نظریۂ خودی پر اچھی گفتگو کی ہے، مگر میر سید میر شکر نے اقبال کی شاعری کے تیسرے دور کا جو غلط تجزیہ کیا ہے اس سے مترجم نے طوالت کا عذر کرکے صرف نظر کر لیا ہے جو مناسب تھا، متن میں جن اشخاص کا ذکر آگیا ہے تعلیقات میں ان کے حالات اور کارناموں کا مختصر مگر متوازن تعارف کرایا ہے، کتاب کے تینوں حصوں سے مترجم کی محنت، علم و ادب سے شغف، اچھے ادبی ذوق اور تحریری سلیقہ کا اندازہ ہوتا ہے، مگر کہیں کہیں کتابت و طباعت کی غلطیاں ہیں جیسے احتیاجی (ص ۹۶) بجائے احتسابی، فارسی زبان ممالک (ص ۱۰۲) بجائے ... زبان کے ممالک، منظر عام پر لیا جا رہا ہے (ص ۱۰۳) بجائے ... کیا جا رہا ہے، ماخوذین کر بری کر دیا۔ (ص ۱۰۶) بجائے ماخوذین کو بری ... ایک جگہ عظمت (ص ۱۰۲) کو مذکر لکھا ہے۔

البلاغت :- مرتبہ۔ مولانا سید محمد غیاث الدین مظاہری، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و

وطباعت بہتر، صفحات ۱۶۰، قیمت دس روپیے، ناشر مکتبہ عزیزیہ ۱۵-۲۳ بخشی بازار، الہ آباد۔

فن بلاغت کی اہمیت اور ادب وانشاپردازی میں کمال ومہارت کے لیے اس کی ضرورت کی بنا پر عربی زبان میں اس پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، اور دوسرے علوم کی طرح علم البلاغت بھی عربی مدارس کے نصاب درس کا لازمی جز ہے، اردو میں بھی اس موضوع پر بعض مفید کتابیں چھپی ہیں، اس نئی کتاب میں پہلے فصاحت وبلاغت کی تعریف اور مقصد بیان کیا ہے، پھر بلاغت کے سہ گانہ علوم معانی، بیان اور بدیع کے مسائل اور مختلف اقسام کی تعریف اور مثالیں تحریر کی گئی ہیں۔ بقول مصنف اب عربی مدارس کے طلبہ محنت ومطالعہ کے عادی نہ ہونے کی وجہ سے ناقص الاستعداد ہوتے ہیں، اور بلاغت کی عربی کتابیں پڑھنے کے باوجود اس فن کے مباحث سے ناآشنا ہی رہتے ہیں اس لئے ان کی سہولت کے لیے یہ کتاب اردو میں لکھی گئی ہے، مگر ظاہر ہے کہ اس سے وہ اور زیادہ سہولت پسندی اور سہل انگاری کے عادی ہو جائیں گے اور ان کی عربی زبان وادب سے دلچسپی مزید کم ہو جائے گی۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مثالیں اردو اور عربی دونوں زبانوں میں دی گئی ہیں تاکہ عربی پڑھنے والے طلبہ کے علاوہ اردو خواں بھی فائدہ اٹھا سکیں۔

آنکھوں کے عطیہ کا شرعی جائزہ:۔ از حکیم مولوی محمد قطب الدین فاروقی صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ معمولی، سائیکلو اسٹائل، صفحات ۲۸، قیمت تین روپیے، پتہ: بیرون یاقوت پورہ، محلہ املی بن مکان نمبر ۱-۳-۵-۴۰۵، حیدر آباد۔

اس زمانہ میں جو نئے فقہی مسائل پیدا ہو گئے ہیں ان میں ایک آنکھوں کے عطیہ کا مسئلہ بھی ہے جو ثقہ علماء کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اس مقالہ میں بھی اس کی حرمت ثابت کی گئی ہے، اور متعدد آیتوں اور حدیثوں کے علاوہ دوسری نوعیت کے دلائل بھی بیان کئے گئے ہیں، گو بعض دلائل میں وزن ہے، مگر مقالہ نگار کی پیش کردہ آیات واحادیث اس باب میں قطعی اور صریح نہیں ہیں،

اس طرح تو ہر چیز ثابت کی جا سکتی ہے، زیر بحث مسئلہ کی نزاکت واہمیت کی بنا پر علماء کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے اور اس سلسلہ میں اس مقالہ سے بھی مدد لینی چاہئے۔

نور نظر کے نام:۔ مترجمہ جناب شیخ نذیر حسین صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۹۰، قیمت دس روپیے، پتہ مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۲ پاکستان۔

نامور مصری فاضل ڈاکٹر احمد امین کے سلسلۂ کتب فجر الاسلام، ضحی الاسلام اور ظہر الاسلام کو غیر معمولی مقبولیت نصیب ہوئی، شیخ نذیر حسین صاحب مدیر اردو انسائیکلو پیڈیا پنجاب یونیورسٹی پہلے بھی ان کی بعض کتابوں کے اردو ترجمے کر چکے ہیں، جن پر معارف میں تبصرے ہو چکے ہیں، اب انھوں نے ان کے انیس خطوط کا اردو ترجمہ کیا ہے، یہ خطوط مشہور مصری ماہنامہ الہلال کی فرمائش پر لکھے گئے تھے، گو یہ فرضی بیٹے کے نام ہیں مگر مکتوب نگار نے جس زمانہ میں یہ سلسلہ شروع کیا تھا، اس زمانہ میں ان کے صاحبزادے انگلستان میں زیر تعلیم تھے، اس لیے یہ دراصل انہی کو مد نظر رکھکر لکھے گئے ہیں، اور گو ان کا تخاطب فرزند سے ہے مگر ان کی نوعیت ایک ماہر اور تجربہ کار بزرگ کے پیغام کی ہے، جو وہ نئی نسل کو دے رہے ہیں، ڈاکٹر احمد امین کا شمار روشن خیال لوگوں میں ہوتا ہے، مگر وہ قدیم تعلیم وتربیت کے پروردہ تھے، اس لئے ان میں جدت وقدامت کا حسین امتزاج تھا، اور مغربی طرز فکر سے متاثر ہونے کے باوجود وہ ذہنی اعتبار سے مشرقی تھے، علاوہ ازیں انھوں نے سرگرم علمی وتعلیمی زندگی گذاری ہے۔ اس لئے یہ کتاب ان کے زریں مشوروں اور علمی وتعلیمی تجربات پر مشتمل ہے، اور اس میں زندگی کے اکثر مسائل زیر بحث آ گئے ہیں مثلاً فرائض وحقوق کی ادائیگی، غفلت، بے پروائی اور کاہلی کی ممانعت، مذہب وروحانیت کی ضرورت، مشرقی ومغربی زندگی کے اچھے اور برے رخ کی وضاحت اور اچھے کو اختیار کرنے کی تلقین، مادی راحت ودنیا کے مقابلہ میں ذہنی وروحانی لذت کی اہمیت، تعلیم ومطالعہ کی قدر وقیمت،

تعلیم گاہوں میں سیاست کے عمل دخل کی ممانعت اور اس کے نقصانات کی وضاحت اور سچائی، راستبازی اور انصاف پسندی کی تلقین وغیرہ، اس طرح یہ کتاب بڑی مفید ہے جو مصر کی طرح دوسرے ملکوں کے طلبہ اور نوجوانوں کے لئے بھی نہایت کارآمد ہے، اسی خیال سے شیخ صاحب نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے جو نہایت سلیس اور شگفتہ ہے۔

حدیث ایک مستقل حجت:۔ مترجمہ، مولوی بدر الزماں صاحب نیپالی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۷۰، قیمت تین روپیے، پتے (۱) کتب خانہ مسعودیہ ۴۰۸۵ اردو بازار، جامع مسجد دہلی، (۲) مکتبہ ترجمان ۲۱۱۶ پولیس اسٹریٹ صدر بازار دہلی۔

یہ علامہ ناصر الدین البانی دمشقی کی کتاب "الحدیث حجۃ بنفسہ فی العقائد والاحکام" کا اردو ترجمہ ہے، وہ اس زمانہ کے مشہور فاضل ہیں، حدیث، اس کے متعلقات اور شروح پر ان کا کام اہم خیال کیا جاتا ہے، مگر انھیں اپنے مسلک میں غلو ہے، اس کتاب کا خاص مقصد ان فقہاء و متکلمین کی تردید ہے، جو احادیث خصوصاً اخبار آحاد کو احکام کی طرح عقائد میں حجت نہیں خیال کرتے اور انھیں موجب عمل ماننے کے باوجود انھیں مفید یقین نہیں مانتے، آخر میں انھوں نے تقلید کی پوری مذمت کی ہے گو انکی بہت سی باتیں صحیح ہیں مگر بعض ان کے غلو و شدت کا نتیجہ ہیں چونکہ عقائد اور دین کے اہمات خود قرآن مجید سے پوری طرح ثابت ہیں اس لیے اہل علم اور اصحاب فقہ کو ان مسائل میں مجرد احادیث کو حجت ماننے میں تامل ہے مصنف نے سنت و حدیث میں فرق نہ کرکے بھی خلط مبحث سے کام لیا ہے، ان کے استدلال میں بھی خامیاں ہیں مثلاً آیات (ما آتاکم الرسول الخ) اور (ان ھو الا وحی یوحی) کے سیاق و سباق کو نظر انداز کرکے انھیں حدیث کی حجیت کے ثبوت میں پیش کرنا اور (فلولا نفر من کل فرقۃ منھم الخ) سے خبر واحد کی حجیت پر استدلال وغیرہ، انھوں نے قیاس کو حدیث پر مقدم کرنے کا الزام جن لوگوں پر عائد کیا ہے وہ اسے تسلیم نہیں کرتے۔

"ض"

ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی فرماں روا خاندان یا فرماں روا اشخاص کی عظمت و شان، پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ ملکی فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی تھیں، خود ہندوستان کے مختلف فرمانروا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار پانچ سو برس اس ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہے لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے، کس قسم کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدانِ جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، اُن کی مختلف ٹکڑیوں کے نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب دار المصنفین کی رفاقت میں آئے، اور اُن کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی کٹھن موضوع دیا جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے عہد وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کرکے پیش کردی، اس میں عہدِ وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً آلاتِ حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدانِ جنگ، قلعے، چھاؤنیاں، کمین گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت:۔ ۲۲ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

"منیجر"